سب سے پہلے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تنقید کی اور بہت سے محققین نے حضرت مجدد صاحب کے مسلک کو شرعی تعبیر سے قریب پاکر اختیار کر لیا، انھوں نے اس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے، ہندوستان میں وحدت الوجود کے سب سے بڑے داعی اور حامی شیخ محب اللہ الہ آبادی تھے، مصنف نے جابجا ان کا ذکر بھی کیا ہے اس لیے ایک قدیم یادگار کی حیثیت سے یہ رسالہ قابل قدر ہے، شروع کتاب میں ثناء الحق صاحب کا ایک طویل، پراز معلومات مقدمہ ہے، جس میں مصنف کے حالات و کارناموں کی پوری تفصیل موجود ہے،

مسئلہ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں } از مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی سندیلوی صفحات ۱۸۷ کتابت و طباعت عمدہ، پتہ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مکتبہ نظام جامع مسجد ٹیکا پور، کانپور،

ختم نبوت کا مسئلہ امت میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہا ہے، اس کے خلاف جب بھی کوئی آواز اٹھی تو امت نے اسے برداشت نہیں کیا، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی سے لیکر مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت تک امت کا یہی طرز عمل رہا، مگر بدقسمتی سے موخر الذکر متنبی کو انگریزوں کی پشت پناہی مل گئی جس کی وجہ سے یہ فتنہ ختم نہیں ہو سکا، اور امت کا ایک گروہ اس کا شکار ہو گیا، اس موضوع پر سو برس کے اندر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں گی، اس لیے یہ موضوع تقریباً مفروغ عنہا ہو چکا ہے، مگر پھر بھی مولانا اسحاق صاحب ندوی نے کچھ نئے زاویہ سے اس پر بحث کی ہے، اور علم و عقل کی روشنی میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ امت کا اس سے اختلاف محض جذباتی نہیں ہے، بلکہ اس فتنہ کی جڑیں کتنی گہری ہیں، اسی لئے عیسائی اور یہودی دونوں اس کی نشو و نما میں مدد دے رہے ہیں، امید ہے کہ مولانا کی یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس میں وہ کامیاب ہوگی۔

م - ج

جلد ۹۴ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۴ء - عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

ہم نے اپریل ۱۹۶۴ء کے معارف میں دار المصنفین کی پچاس سالہ جوبلی منانے کا اعلان کیا تھا، مگر اس کے ایک ہی مہینہ کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کا حادثہ پیش آگیا، جس نے پورے ملک کو رنج و الم میں مبتلا کر دیا، اس غمناک فضا میں کسی تقریب مسرت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے جوبلی کا کام بھی رک گیا تھا، اب پھر اس کو شروع کیا گیا ہے، جوبلی کے مصارف کا اندازہ ۲۰-۲۵ ہزار تک ہے، اتنی بڑی رقم کا متحمل دار المصنفین نہیں ہو سکتا، اس کے لیے بمبئی، مدراس اور حیدرآباد کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں، کلکتہ کے مسلمان خود اپنے مصائب میں مبتلا ہیں، اس لیے ہم نے قصداً اس کو چھوڑ دیا، ان تینوں شہروں میں ہمیشہ سے دار المصنفین کے قدر دانوں کی ایک جماعت موجود رہی ہے، اور اصحاب ثروت مسلمان بھی انہی شہروں میں ہیں، اس لیے قدرۃً انہی سے زیادہ توقع بھی ہے، بمبئی کے مخلصوں نے خاص طور سے دار المصنفین کی آواز پر لبیک کہا اور سرمایہ کی فراہمی کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔

بمبئی میں سیٹھ عبد العزیز صاحب انصاری (ان کا وطن اعظم گڈھ ہے اور وہ مولانا شبلی کی برادری اور بمبئی کے صاحبِ ثروت طبقہ کے ممتاز رکن ہیں) مسٹر اے فیضی سابق سفیر حکومت ہند، پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سید شہاب الدین صاحب دیسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ و رکن مجلس انتظامیہ دار المصنفین، عبد الرزاق صاحب قریشی رفیق انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ، ان مخلصوں کا دار المصنفین سے محض علمی تعلق نہیں بلکہ ان سے گوناگوں وطنی اور عزیزانہ تعلقات ہیں، مدراس میں مولانا سید عبد الوہاب صاحب بخاری پرنسپل نیو کالج، مولانا محمد یوسف صاحب کوکنی عمری صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو و اسلامیات مدراس یونیورسٹی اپنے اپنے شہروں میں جوبلی کے لیے کوشش کر رہے ہیں، سید علی جواد زیدی انفارمیشن افسر (دہلی) بھی دار المصنفین کے

خاص ہمدردوں میں ہیں، کویت کے ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب اپنی جیب خاص سے دار المصنفین کی مدد کرتے رہے، اس موقع پر بھی ان سے ہمدردی کی توقع ہے، دار المصنفین اپنے تمام مخلصوں اور قدر دانوں کا شکر گذار ہے۔

دار المصنفین کا سب سے زیادہ حق حیدرآباد پر ہے، حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں ہی کی مدد سے دار المصنفین قائم ہوا اور ان کے خاتمہ تک برابر ان کی امداد اور سرپرستی قائم رہی، بھوپال تو بالکل ختم ہو چکا لیکن حیدرآباد میں اب بھی دار المصنفین کے قدر داں اور علم دوست اصحاب موجود ہیں، ان میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کا نام سر فہرست ہے، وہ دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہیں، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب اور پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب سے ان کی علم دوستی کی بنا پر توقع ہے کہ وہ اس کام میں عملی دلچسپی لیں گے

دار المصنفین کا مستقر اتر پردیش یوں تو ہمیشہ سے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کی قومی تحریکوں کا مرکز رہا ہے، ان کے تمام بڑے بڑے ادارے یہیں ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان اداروں کی طرف ان کی توجہ ہمیشہ کم رہی ہے، یہاں کے امراء کا طبقہ تو اب ختم ہو چکا، پھر بھی ان کی کچھ یادگاریں باقی ہیں، اور اصحاب ثروت تاجروں کا تو بڑا طبقہ موجود ہے، مگر ان سے ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے، یہ خود ان کی غیرت کا امتحان ہے کہ ان کے صوبے کے جس کام میں بمبئی اور مدراس کے لوگ مدد کر رہے ہیں، ان میں خود ان کا حصہ کیا رہتا ہے،

اس وقت دار المصنفین کو کہیں سے کوئی امداد نہیں مل رہی ہے، اور اس کی آمدنی کا دار و مدار صرف کتابوں کی تجارت پر رہ گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لیے ناکافی ہے، اس کے علاوہ اس کے پیش نظر جو علمی منصوبے اور بعض تعمیری ضروریات ہیں اس کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے، دار المصنفین نے آج تک نہ کبھی حکومت سے کوئی مستقل امداد لی اور نہ قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کیا، حکومت نے جو تھوڑی بہت مدد دی وہ وقتی اور مخصوص کاموں کے لیے تھی، مستقل مدد لینا

خود دار المصنفین نے اپنی آزادی کے خلاف تصور کیا اور اس روش پر وہ اب بھی قائم ہے، اسی لیے اس نے جوبلی کے لیے بھی عام چندہ کی اپیل نہیں کی، بلکہ اس کے لیے بھی اس نے دو صورتیں رکھی ہیں، ایک لائف ممبری جس کی فیس ایک ہزار روپئے ہے، اس کے معاوضہ میں ممبروں کو تاحیات دار المصنفین کی مطبوعات اور رسالہ معارف ہدیۃً پیش کیا جاتا ہے، اس طرح ممبری کی فیس کا بڑا حصہ کتابوں کی شکل میں مل جاتا ہے، لیکن جو لوگ بغیر کسی معاوضہ کے جوبلی میں مدد کرنا چاہیں، اس کو بھی شکریہ اور احسانمندی کے ساتھ قبول کیا جائے گا، اس لیے ہم کو توقع ہے کہ علم دوست اور صاحب حیثیت اصحاب خود بھی اس کے لائف ممبر بنیں گے، اور اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کو بھی بنانے کی کوشش کریں گے۔

افسوس ہے کہ ادھر چند مہینوں کے اندر دنیائے علم و ادب کی کئی نامور ہستیوں، پروفیسر حامد حسن صاحب قادری، سید ہاشمی صاحب فرید آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد نے انتقال کیا، پروفیسر حامد حسن صاحب قادری ہماری پرانی علمی بزم کی یادگار تھے، اردو اور فارسی زبان و ادب اور اس کی تاریخ پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی، تاریخ داستان اردو ان کی وسعت نظر کی شاہد ہے، وہ عرصہ تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو اور فارسی کے استاد رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے گئے تھے، اور وہیں وفات پائی، ان کی وفات سے ایک پرانی علمی و تہذیبی یادگار مٹ گئی،

سید ہاشمی فرید آبادی اردو کے نامور مصنف اور اردو زبان کے پرانے خدمت گذار تھے، برسوں بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کے کاموں میں ان کے دست راست رہے، غالباً کچھ دنوں دار الترجمہ حیدر آباد سے بھی ان کا تعلق رہا تھا، انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے لیے ہندوستان کی تاریخ پر کئی کتابیں تالیف و ترجمہ کیں، عین قیام پاکستان کے بعد وہ بھی مولوی عبد الحق صاحب کے ساتھ کراچی چلے گئے تھے، انھوں نے لاہور کے قدیم عمال و حکام، علماء و مشائخ اور شعراء و مصنفین کے حال میں ایک کتاب ماثر لاہور کے نام سے لکھی تھی، مولانا صلاح الدین احمد صاحب اردو کے صاحب طرز ادیب بلکہ ادیب گر تھے، ان کے فیض تربیت سے بہت سے نوجوانوں میں اردو زبان و ادب کا صحیح مذاق پیدا ہوا، ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گذری، وہ بجائے خود ایک "ادبی دنیا" تھے، ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا، اللہ تعالیٰ ان تینوں اصحاب کمال کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

فساد زمانہ اور عمومی بلویٰ

از جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

اسلامی شریعت نے معاملاتی اور تمدنی امور میں انسان کو غیر معمولی مشقت سے بچانے اور ناساز گار حالات میں اسلامی احکام کے منشاء و مقصد کے تحفظ کے لیے رفع حرج اور تیسیر و تسہیل کی جو صورتیں پیدا کی ہیں، ان میں عموم بلویٰ کا لحاظ اور فساد زمانہ کی رعایت بھی ہے، مگر اس لحاظ و رعایت کا مقصد محارم شریعت کا استحلال یا احکام شریعت کا تعطل نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد اس کی دوامی حیثیت کی حفاظت اور اس کو بالکلیہ تعطل سے بچانا ہے،

اسلامی عقائد و عبادات میں تو کسی وقت بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق زندگی کی تغیر پذیر قدروں سے نہیں ہے، مگر معاملاتی، معاشرتی اور تمدنی احکام کا معاملہ بالکل جدا ہے، ان کا مدار انسانی زندگی کی مادی قدروں پر ہے، جو ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں، ان میں روز آنہ نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان پر معاشرہ کے فساد و صلاح کا براہ راست اثر پڑتا ہے، اس لیے اسلامی شریعت نے معاملاتی و تمدنی معاملات کے سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں، ان میں حلال و حرام کی بنیادی و دوامی قدروں کے تحفظ کے ساتھ قیاس و اجتہاد کی ایسی صورتیں رکھی ہیں جن سے شریعت کا منشا و مقصد بھی فوت نہیں ہونے پاتا اور اسلامی احکام معاشرہ کے ارتقاء میں حائل بھی نہیں ہوتے، یہ تیسیر و تسہیل کی آزادی اس حد تک ہے

جب تک کہ حلال وحرام کی وہ بنیادی قدریں متاثر نہیں ہوتیں جن کا رشتہ دینی ایمان سے جڑا ہوا ہے، مثلاً اسلامی شریعت نے بہت سی چیزیں حرام، مکروہ اور ناجائز قرار دی ہیں، یا اس کے بارے میں کچھ اصولی ہدایتیں دیدی ہیں، مگر بعینہٖ ان پر تعامل میں انسان کو مستقل شدید دقتیں محسوس ہوتی ہیں، یا عارضی تکلیف کا امکان ہوتا ہے، اسلیے فقہا شریعت کے منشا کے مطابق اس میں تخصیص وتقیید کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تخصیص وتقیید اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ نہ تو شریعت کا منشا بالکلیہ فوت ہونے پائے اور نہ انسان غیر معمولی تکلیف میں مبتلا ہو جائے جیسا کہ شریعت نے حکم دیا ہے،

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ)
اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا،

اسی طرح بہت سے احکام ایک خاص ماحول اور زمانہ میں بہت ہی مفید ہوتے ہیں، مگر ایک مدت کے بعد ماحول، ذرائع اور اخلاق عامہ کے بدل جانے کی وجہ سے ان کی افادیت یا تو باقی نہیں رہتی یا اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، اب اگر شرعی حکم کی علت اور منشا کو نظر انداز کر کے بعینہٖ اس حکم پر عمل کیا جائے تو یا عمل کرنے والا تکلیف مالا یطاق میں مبتلا ہو جائے گا یا پھر شریعت کا منشا یا اس حکم میں رخصت، تیسیر اور نفی حرج کا جو پہلو ہے وہ نظر انداز ہو جائے گا، چنانچہ اسی بنا پر تمام ہی مسالک کے متاخر فقہا نے اپنے مسلک کے ائمہ اور متقدم فقہا کے بہت سے فتاوی کے خلاف فتوے دیے ہیں اور اپنے پیش رووں سے اختلاف کی وجہ متاخر فقہا نے اختلاف الزمان اور فساد الاخلاق ہی بیان کی ہے متاخرین کا متقدمین سے یہ اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر متقدم فقہا وائمہ بھی ان کے زمانہ میں موجود ہوتے تو حالات کی تبدیلی اور فساد اخلاق کی بنا پر وہی رائے دیتے، اسی عموم بلوی اور فساد زمانہ کی بنیاد پر فقہا نے یہ اصول مقرر کیے ہیں،[1]

---

[1] نشر العرف ج ۲ ص ۱۲۵

لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان — حالات کے بدلنے سے احکام کی تبدیلی سے انکار نہیں کیا جا سکتا،

الامر اذا ضاق اتسع — جب کوئی تنگی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں وسعت ہوتی ہے

الضرر یدفع بقدر الامکان — تکلیف حتی الامکان دفع کی جاتی ہے،

الضرورۃ مستثناۃ من قواعد الشرع — ضرورت شریعت کے قواعد سے مستثنیٰ ہوتی ہے،

المشقۃ تجلب التیسیر — مشقت آسانی لاتی ہے

الضرورات تبیح المحظورات — ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عموم بلوی، مشقت وحرج اور فساد زمان کا ہر صورت میں لحاظ کیا جائے گا، یا کسی تخصیص اور تقیید کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے گا، اس سلسلہ میں فقہا نے اسلامی احکام کی دو صورتیں قرار دی ہیں، ایک یہ کہ اس تغیر وتبدل یا حرام ومکروہ میں تخصیص کا تعلق شریعت کے منصوص وصریح احکام سے ہو، دوسرے یہ کہ ان کا تعلق اجتہادی مسائل سے ہو، پہلی صورت کے بارے میں ان کا عام اصول تو یہ ہے کہ

المشقۃ والحرج انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ (الاشباہ ص ۷)
مشقت اور تنگی کا لحاظ اس امر میں کیا جائے گا جس میں کوئی نص موجود نہ ہو،

فقہ کا یہ اصول مسلمہ ہے کہ منصوص احکام میں کوئی تغیر وتبدل جائز نہیں ہے، مگر چونکہ شریعت نے اسلامی احکام کے نفاذ میں انسان کے مزاج، ماحول اور اس کے مصالح اور مضار کا بھی لحاظ کیا ہے اس لیے جب کسی حکم پر بالکلیہ عمل کرنے میں شدید مشقت یا مجبوری لاحق ہو رہی ہو یا ماحول کے بگاڑ یا کسی اور سبب سے کسی برائی سے بالکلیہ بچنا ممکن نہ رہ گیا ہو تو فقہا یا تو اس حکم میں تخصیص کرتے ہیں یا پھر اس کے مثبت پہلو کے بجائے اس کے منفی پہلو یعنی نفی حرج والے پہلو کو اختیار کرتے ہیں، بشرطیکہ یہ چند افراد کا مسئلہ نہ ہو

بلکہ پورے معاشرہ کا معاملہ ہو، یا اگر وہ مخصوص افراد کا معاملہ ہو تو وہ مشقت اور حرج غیر معتاد قسم کا ہو، امام شاطبی نے اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی ہے،

حیث تکون المشقۃ الواقعۃ	اگر یہ مشقت جو واقع ہوئی ہے ایسی ہے
بالمکلف فی التکلیف خارجۃ	جس سے عمل کرنے والے کو غیر معتاد قسم کی
عن معتاد المشقات فی الاعمال	تکلیف ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ اس سے
العادیۃ حتی یحصل بھا فساد	دینی و دنیاوی کوئی خرابی کے پیدا ہونے
دینی او دنیوی فمقصود الشارع	کا امکان ہے، تو شریعت کا منشا یہ ہے
فیھا الرفع علی الجملۃ	کہ اس کو بالکلیہ دفع کیا جائے،

پھر آگے لکھتے ہیں :-

اذا کان الحرج فی نازلۃ عامۃ	اگر یہ تنگی کسی ابتلائے عام کی وجہ سے
فی الناس فانہ یسقط واذا کان	پیدا ہوئی ہے تو اس کو بہرحال رفع کیا جائیگا
خاصًا لم یعتبر[1] عند نا (ج ۲ ص ۱)	اور اگر یہ خاص ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہے،

لیکن فساد زمانہ یا عموم بلوی کی وجہ سے جو حرج و مشقت پیدا ہوئی ہو اس کی تعیین اور اس کو دفع کرنے کے سلسلہ میں منصوص حکم کی تخصیص و تقیید کیجائے یا نہ کیجائے، اور اگر کیجائے تو کس حد تک کیجائے، یہ بڑا نازک مسئلہ ہے، اس لیے فقہائے کرام نے اس میں کافی رد و قدح کی ہے، اسی نزاکت کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے موجودہ دور کے متجد دفقہا ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، اور شریعت کے بہت احکام کو انھوں نے بازیچۂ اطفال بنا لیا ہے، اس سلسلہ میں فقہاء کے کچھ خیالات کی تفصیل آگے آتی ہے؛

[1] بعض ائمہ کے نزدیک خاص حرج بھی معتبر ہے، مگر اس میں انھوں نے معتاد اور غیر معتاد کی قید لگا دی ہے، اس لیے اس اختلاف کا شریعت کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا،

اب رہی دوسری صورت تو اس کے بارے میں بات صاف ہے، وہ یہ کہ اگر کسی قیاسی و اجتہادی مسئلہ کی وجہ سے یہ دقت و مشقت پیش آتی ہے، تو اس کو ترک کر کے اس وقت کے حالات اور مقتضیات کے مطابق پیش آمدہ مسائل کو شریعت کے منشا کے قریب لانے کی کوشش کی جائے گی، جیسا کہ عرف میں ہوتا ہے، عموم بلوی اور فساد زمانہ میں دفع حرج، تیسیر کی خاطر کسی منصوص حکم کی تخصیص کرتے ہوئے یہ بات بہرحال ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے دین کے مقاصد اور ان بنیادی ضرورتوں پر کوئی اثر نہ پڑے، جن کو شریعت اسلامی انسانی زندگی کا قوام اور مدار سمجھتی ہے، شریعت میں یہ ضروریات پانچ ہیں۔

مجموع الضروریات خمسۃ حفظ	تمام ضروریات کی پانچ قسمیں ہیں، دین
الدین والنفس والنسل والمال	نسل، جان، مال اور عقل کی حفاظت۔
والعقل (موافقات ج ۲ ص ۴)	

ان ضروریات کا مطلب کیا ہے، اس کی طرف عزالدین عبدالسلام متوفی ۶۶۰ھ نے قواعد الاحکام میں اشارہ کیا ہے، اور امام شاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے،

فصالح الدنیا والآخرۃ ثلاثۃ	دنیا و آخرت کی بھلائیوں کی تین قسمیں ہیں اور
اقسام کل قسم منھا فی منازل متفاوتۃ	ان میں سے ہر قسم کے مختلف درجے ہیں، تو
فاما مصالح الدنیا فتنقسم الی	دنیا کے مصالح کی تین قسمیں ہیں، ضرورات
الضرورات والحاجات والتتمات	حاجات اور تکملات، ضرورات سے مراد
والتکملات فالضرورات	کھانا پینا، پہننا، شادی بیاہ کرنا، سواری
کالمآکل والمشارب والملابس	جو رزق کے حصول میں معاون ہو، اسی طرح
والمناکح والمراکب الجوالب للاقوات	جس کی ضرورت بھی پیش آجائے، ان کا اقل
وغیرھا مما تمس الیہ الضرورات	درجہ تو ضروری ہے، مگر اس کا اعلیٰ درجہ یعنی

واقل المجزی من ذالک ضروری وماکان فی ذالک فی اعلی المراتب کالمآکل الطیبات، والملابس الناعمات والغرف العالیات والمراکب النفسیات فهو من التمات وما توسط بینهما فهو من الحاجات واما مصالح الآخرة ففعل الواجبات واجتناب المحرمات من الضروریات وفعل السنن الموکدات الفاضلات من الحاجات وما عدا ذالک فهی من المتممات

اچھا کھانا، عمدہ لباس، شاندار مکانات، بہترین سواریاں تو تکملات و تتمات میں ہیں، اور ان دونوں کے درمیان جو ضرورتیں ہیں وہ حاجات ہیں، اسی طرح آخرت کے مصالح تو واجبات کی بجاآوری محرمات سے اجتناب ضروریات میں ہیں اور سنن موکدات فاضلات حاجات میں سے ہیں اور ان کے علاوہ متممات ہیں،

امام شاطبی اس کی مزید توضیح کرتے ہیں:

فاما الضروریة فمعناها انها لا بد منها فی قیام مصالح الدین والدنیا بحیث اذا فقدت لم تجر مصالح الدنیا علی استقامة بل علی فساد وتهارج وفوت حیاة وفی الاخری فوت النجات والنعیم والرجوع بالخسران المبین

(ج ۲ ص ۴)

ضروریات میں کسی چیز کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حفاظت پر دین و دنیا کے بقا کا اس حیثیت سے مدار ہے کہ اگر انکی رعایت و حفاظت نہ کیجائے تو نہ صرف یہ کہ دنیا کے وجود کے سارے مصالح مفقود ہوجائیں گے، بلکہ اس میں فساد و اختلال رونما ہوجائیگا اور انسانی زندگی معطل ہوکر رہ جائیگی، دوسری طرف آخرت کی کامیابی اور اسکی نعمتیں حرمان و خسران سے بدل جائیں گی

ان ضروریات کی مثبت و منفی حفاظت کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والحفظ لها یکون بامرین احدهما ما یقیم أرکانها ویثبت قواعدها وذالک عبارة عن مراعاتها من جانب الوجود والثانی ما یدرأ عنها الاختلال الواقع أو المتوقع فیها وذالک عبارة عن مراعاتها من جانب العدم فاصول العبادات راجعة الی حفظ الدین من جانب الوجود کالایمان والنطق بالشهادتین والصلوٰة والزکوٰة والصیام والحج وما أشبهها ذالک والعادات راجعة الی حفظ النفس والعقل من جانب الوجود أیضا کتناول الماکولات والمشروبات والملبوسات والمسکونات وما اشبه ذالک والمعاملات راجعة الی حفظ

ان کی حفاظت دو طریقوں سے ممکن ہے ایک یہ کہ جن چیزوں پر ان کی بنیاد ہے اور جن ستونوں پر یہ قائم ہیں ان کو باقی اور قائم رکھا جائے، یہ اس کی رعایت و حفاظت کا مثبت پہلو ہے، دوسرے یہ کہ اس کو حال و مستقبل کے اختلال و انتشار سے بچایا جائے اور ان کی حفاظت کا منفی پہلو ہے، چنانچہ اصول عبادات مثبت طور پر دین کی حفاظت کرتے ہیں، جیسے ایمان بالقلب اور اقرار باللسان، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج وغیرہ اسی طرح عادات انسانی اس کے نفس و عقل کی وجودی طور پر حفاظت کرتی ہیں، مثلاً کھانا، پینا، پہننا، مکان وغیرہ، اسی طرح معاملات نسل و مال کے وجود کا تحفظ کرتے ہیں، اور ساتھ ہی عقل اور نسل انسانی کی حفاظت بھی ان سے

النسل والمال من جانب الوجود
والی حفظ النفس والعقل ایضا
لکن بواسطة العادات والجنایات
ویجمعها الامر بالمعروف والنهی
عن المنکر ترجع الی حفظ الجمیع
من جانب العدم

ہوتی ہے، لیکن عادات کے واسطہ سے
اور جنایات جن کو امر بالمعروف اور نہی
عن المنکر سمیٹے ہوئے ہے، یہ عبادات
معاملات اور عادات سبھی کی حفاظت
منفی طور پر کرتے ہیں۔

ان بنیادی ضرورتوں کے ساتھ دو طرح کی اور ضرورتیں ہیں جن کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، ان کا نام امام شاطبی نے حاجیات اور تحسینیات رکھا ہے۔ ان دونوں کی دین میں کیا حیثیت ہے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

واما الحاجیات فمعناها أنها
مفتقر الیها من حیث التوسعة
ورفع الضیق المؤدی فی الغالب
الی الحرج والمشقة بفوت المطلوب
فاذا لم تراع دخل علی المکلفین علی
الجملة الحرج والمشقة ولکنه لا
یبلغ مبلغ الفساد العادی المتوقع
فی المصالح العامة وهی جاریة
فی العبادات والعادات والمعاملات
والجنایات ففی العبادات کالرخص

اور حاجیات سے مراد وہ امور ہیں جن کی
ضرورت زندگی میں سہولت پیدا کرنے
اور ایسی تنگی کے دفع کرنے میں پڑتی ہے،
جن کی وجہ سے عموماً مشقت و تکلیف پیدا
ہو جاتی ہے، اگر ان کی رعایت نہ کیجائے
تو زندگی سراسر تکلیف و مشقت سے پر ہو جائے گی
ان سے فساد عام نہ پیدا ہو، یہ عبادات
عادات، معاملات اور جنایات تمام ہی
شعبوں پر پائے جاتے ہیں، جیسے عبادات
میں مرض اور سفر کی دقتوں سے بچانے کیلئے

المخففة بالنسبة الی لحوق المشقة
بالمرض والسفر وفی العادات
کاباحة الصید والتمتع بالطیبات
مما هو حلال مأکلا ومشربا
وملبسا ومسکنا ومرکبا وما
اشبه ذلك وفی المعاملات
کالقراض والمساقاة والسلم
والغاء التوابع فی العقد علی
المتبوعات کثمرة الشجر ومال
العبد..........

کچھ رخصتیں دی گئی ہیں، عادات میں جیسے
شکار کی اباحت یا پاکیزہ حلال چیزوں کا
کھانے پینے اور کپڑے، سواری میں استعمال وغیرہ
اسی طرح معاملات میں مضاربت مساقات
بیع سلم، یا بیع کو متبوع کے تحت
لانا، مثلاً درخت کے ساتھ پھل کی بیع یا
غلام کا مال وغیرہ، اسی طرح جنایات میں
قسامت، پیشہ وروں پر تاوان وغیرہ
لگانا۔

واما التحسینات فمعناها الأخذ
بما یلیق من محاسن العادات وتجنب
الاحوال المدنسات التی تأنفها
العقول الراجحات ویجمع ذلك
قسم مکارم الأخلاق وهی جاریة
فیما جرت فیه الأولیان ففی العبادات
کازالة النجاسة وبالجملة
الطهارات کلها وستر العورة
واخذ الزینة والتقرب بنوافل

اور تحسینیات کا مقصد ان چیزوں کا استعمال ہے
جو عادات انسانی میں حسن پیدا کرتی ہیں یا ایسی
چیزوں سے بچنا جن سے عقل سلیم ابا کرتی ہے،
یہ مکارم اخلاق کی ایک قسم ہے، اس کا تعلق
بھی پہلی دونوں قسموں کی طرح احکام اسلامی
کے تمام ہی شعبوں سے ہے، عبادات میں
جیسے ازالہ نجاست، تمام طہارتیں، ستر عورت
اخذ زینت، نوافل کے ذریعہ تقرب وغیرہ،
عادات جیسے کھانے پینے کے آداب، کھانے پینے

الحیوانات من الصدقات والقربات
واشباہ ذالک وفی العادات
کآداب الاکل والشرب ومجانبۃ
الماکل النجاسات والمشارب
المستخبثات والاسراف والاقتار
فی المتناولات وفی المعاملات
کالمنع من بیع النجاسات وفضل
الماء والکلأ وسلب العبد منصب
الشھادۃ والامامۃ وسلب المرأۃ
منصب الامامۃ وفی الجنایات
کمنع قتل الحر بالعبد اوقتل
النساء والصبیان والرھبان فی
الجھاد۔

میں ناپاک اور گندی چیزوں سے پرہیز
اخراجات میں اسراف اور بخل سے گریز
وغیرہ معاملات میں جیسے ناپاک چیزوں
کی بیع روکنا، ضرورت سے زیادہ
پانی اور گھاس کو روکنا یا غلام اور عورت
کی شہادت اور امامت سے محرومی وغیرہ
اسی طرح جنایات مثلاً غلام کے بدلے
آزاد کے قتل سے روکنا، یا جہاد میں
عورتوں، بچوں اور راہبوں کے
قتل سے منع کرنا، وغیرہ

ان تینوں طرح کے احکام کی حیثیت ایک دوسرے کے معاون اور مکمل کی ہے،

ومن امثلۃ ھذہ المسئلۃ ان الحاجیات
کالتتمۃ للضروریات وکذالک
التحسینیات فات الضروریات
ھی اصل المصالح (ص ۶ ج ۲)

اس مسئلہ میں جو مثالیں دی گئی ہیں اس سے
معلوم ہوا کہ حاجیات کی حیثیت ضروریات
کے لیے تتمہ کی ہے، اسی طرح تحسینیات کی حیثیت
حاجیات کے تکملہ کی ہو، اس لیے کہ ضروریات
ہی پر دراصل مصالح شریعت کا مدار ہے،

نفاذ احکام میں ان تینوں کا لحاظ کس ترتیب سے کیا جائیگا، اور کس کو اس وقت مقدم اور کس کو مؤخر
رکھا جائے گا اسکی تفصیل ملاحظہ ہو:-

کل تکملۃ فلھا من حیث ھی تکملۃ شرط
وھو ان لا یعود اعتبارھا علی
الأصل بالابطال وذالک
ان کل تکملۃ یفضی اعتبارھا
الی رفض اصلھا فلا یصح اشتراطھا
عند ذالک لوجھین احدھما
ان فی ابطال الاصل ابطال
التکملۃ لان التکملۃ مع ماکملتہ
کالصفۃ مع الموصوف فاذا کان
اعتبار الصفۃ یؤدی الی ارتفاع
الموصوف لزم من ذالک ارتفاع
الصفۃ ایضاً فاعتبار ھذہ التکملۃ
علی ھذا الوجہ مؤد الی
عدم اعتبارھا وھذا محال
والثانی انا لو قدرنا تقدیرا
ان المصلحۃ التکمیلیۃ تحصل
مع فوات المصلحۃ الاصلیۃ لکان

تمام تکمیلی احکام کے تکمیل کی شرط یہ ہے کہ وہ
اصل کو باطل نہ کردیں، ایسا اس لیے ہے
کہ جو تکمیلی امور اصل کو معطل کردینے والے
ہوں تو دو وجہوں سے ان کا مشروط
ہونا صحیح نہیں ہوگا، ایک یہ کہ اصل کے
ابطال سے خود تکملہ بھی باطل ہوجائیگا،
اس لیے کہ اس کی حیثیت صفت موصوف
کی ہے، یعنی ضروریات موصوف ہیں اور
تکملات صفت، جب موصوف نہ ہو تو صفت
کا وجود کیسے ہوسکتا ہے،

دوسرے یہ کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ مصلحت اصلیہ
کے فوت ہونے کے باوجود مصلحت تکمیلی
کا حصول ممکن ہے تو مصلحت اصلیہ ہی کا اعتبار

حصول الاصلية اولى لما بينهما
من التفاوت وبيان ذالك ان حفظ
المهجة مهم كلي وحفظ المروات
مستحسن فحرمت النجاسات حفظا
للمروآت واجراء لاهلها على محاسن
العادات فان دعت الضرورة الى
احياء المهجة بتناول النجس كان
تناوله اولى وكذلك اصل البيع
ضروري ومنع الغرر والجهالة
مكمل فلو اشترط نفي الغرر جملة
لانحسم باب البيع وكذلك الاجارة
ضرورية او حاجية واشتراط
حضور العوضين في المعاوضات
من باب التكميلات ولما كان ذالك
انى بيع الا [illegible] من غير عسر
منع من بيع المعدوم الا في السلم
وذالك في الاجارات ممتنع فاشتراط
وجود المنافع فيها وحضورها يسد باب
المعاملة بها والاجارة محتاج

کرنا چاہیے اس لیے کہ دونوں کے مرتبہ میں
فرق ہے۔ اس اعتبار سے اصل کا حصول
زیادہ بہتر ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً
جان کی حفاظت اہم بنیادی ضرورت ہے
اور انسانی شرافت وغیرت کی حفاظت
مستحسن ہے تو نجاست کی حرمت اسی
انسانی شرافت و نیک نفسی کی حفاظت کے لیے
تاکہ لوگوں میں اچھی عادتیں پیدا ہوں تو
اب اگر جان بچانے کے لیے نجاست کے استعمال
کی ضرورت پڑ جائے تو اس کو استعمال کرکے
جان بچا لینا زیادہ بہتر ہے، اسی طرح اصل
بیع ضروری ہے اور اس میں دھوکہ، عدم علم
کا نہ ہونا اس بیع کی تکمیل ہے، تو اگر اس میں
دھوکہ کی نفی کی شرط لگا دی گئی ہو تو اس سے
ہم بیع کو ختم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اجارہ
ضروری یا حاجی ہے، اور معاوضات میں
عوضین کے سامنے ہونے کی شرط یہ تکمیلات
میں ہے، تو چونکہ اعیان کی بیع میں یہ بغیر کسی
دقت کے ممکن تھا اس لیے بیع سلم کے علاوہ

اليها فجازت وان لم يحضر العوض
اولم يوجد ومثله جار في الاطلاع
على العورات للمباضعة والمداواة
وغيرها وكذلك الجهاد مع ولاة
الجور قال العلماء بجوازه قال
مالك لو ترك ذالك لكان ضررا
على المسلمين فالجهاد ضروري
والوالي فيه ضروري والعدالة
فيه مكملة للضرورة والمكمل اذا
عاد للاصل بالابطال لم يعتبر
ولذلك جاء الامر بالجهاد مع
ولاة الجور عن النبي صلى الله عليه وسلم
وكذلك ما جاء من الامر بالصلوة
خلف الولاة السوء فان في ترك
ذالك ترك سنة الجماعة والجماعة
من شعائر الدين المطلوبة والعدالة
مكملة لذلك المطلوب ولا يبطل
الاصل بالتكملة ومنه اتمام الاركان
في الصلوة مكمل لضرورتها فاذا

اور دوسرے طریقوں میں بیع معدوم کو ممنوع
قرار دیا گیا لیکن اجارات میں منافع کا حاضر کرنا
اور سامنے ہونا ناممکن ہے، اسلیے کہ اگر یہ شرط
لگا دیجائے تو اجارات کا دروازہ ہی بند ہو جائے،
اور اجارہ کی ضرورت ہے، اسلیے بغیر حضور منافع
بھی اس کو جائز قرار دیا گیا باوجودیکہ یہ معاوضات
میں سے ہے یہی صورت مباشرت اور علاج وغیرہ
کے وقت شرمگاہ کے کھولنے کی ہے، اسی طرح
ظالم حکمرانوں کے ساتھ جہاد کو علماء نے جائز
قرار دیا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر اسے چھوڑ دیا
گیا تو مسلمانوں کو اس سے نقصان پہنچے گا، تو
جہاد اور والی ضروری ہیں اس کا ثقہ و عادل ہونا
اس ضرورت کی تکمیل ہے، اور جب تکمیل اصل ہی کو
باطل کردے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اسی لیے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاۃ جور کے ساتھ جہاد کا حکم
دیا ہے، اسی طرح برے حکمرانوں کے پیچھے نماز کا
مسئلہ ہے کہ اس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے،
کیونکہ انکے ترک سے جماعت کا ترک لازم آتا ہے،
اور جماعت شعار دین میں ہے جو مطلوب ہے،

ادی طلبہ الی ان لا تصل کالمریض
غیر القادر سقط المکمل ارکان فی
انما ھا حرج ارتفع الحرج عمن لم
یکمل وصلی علی حسب ما اوسعتہ
الرخصة

اور عدالت اور ثقاہت سے اس مطلوب کی تکمیل ہوتی ہے
اور اصل مطلوب تکمیلی امور سے باطل نہیں ہو سکتا
اسی طرح ارکان نماز کا پورا کرنا نماز کی اصل ضرورت
کی تکمیل ہے، اب اگر یہ اصل مطلوب بغیر اسکی ادائیگی
کے ادا ہو جائے، جیسا کہ مریض جو اسکی ادائیگی کی
قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں حکم ہے
یا اس کی ادائیگی میں شدید تکلیف کا اندیشہ ہو
تو تکلیف اس سے دور کیجائیگی، اور جس طرح بھی
ممکن ہو وہ نماز پڑھ سکتا ہے، اسی طرح
بہت سی شرعی چیزوں کا حکم ہے،

وانظر فیما قالہ الغزالی فی الکتاب
المستظھری فی الامام الذی
لم یستجمع شروط الامامة
واحمل علیہ نظائرہ

اس سلسلہ میں امام غزالی نے اپنی کتاب
المستظہری کہ جس میں امامت کی تمام شرطیں
نہ پائی جائیں اسکے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور
اسکی جو نظیریں دی ہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے:

(باقی)

تبع تابعین

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

صفحات ۵۶۷   قیمت: ۔ ۔   منیجر

لفظ ہندی کی تحقیق

اور

اس کی شاعری پر ایک نظر

از جناب زیدی جعفر رضا ایم اے ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

زمانۂ بندگی یا بھکتی کال کی ہندی شاعری ہندوستانی عوام نے جب مسلمانوں کی حکومت کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط ہوتی ہوئی دیکھیں تو ان میں شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو گیا، اس حالت میں ان میں عشق خداوندی کا جذبہ پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن انسان کے طبائع مختلف ہیں، چنانچہ لوگوں نے تو اپنے کو خدا کے لیے وقف کر دیا، شباب اور محبت کی رنگینیوں کے گیت گاتے رہے۔

ہندی کے کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ بھکتی کی شاعری بت پرستی کے خلاف مسلمانوں کی آواز کا ردعمل ہے لیکن اس کو واقعہ سے زیادہ تعلق معلوم نہیں ہوتا کیونکہ تحریر سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اب تک کوئی ایسی تصنیف دریافت نہیں ہوئی ہے جس میں اس کی صراحت ہو، اس لیے اس کی حیثیت قیاس سے زیادہ نہیں ہے،

رو بندر ناتھ ٹھاکر نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ادب آدمی اور اس کے ماضی اور حال کا دور اور قریب کا انترنگ ملن ہے، بھکتی کال کی ہندی شاعری کو ٹیگور کے اس جملہ کی روشنی میں خالص ادب کہا جا سکتا ہے، عام طور پر بھکتی کال کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، پہلا نرگن کا بیہ اور دوسرا سگن کا بیہ، ایک میں معبود حقیقی کا تصور مادی پیکر کی شکل میں نہیں ہوتا، دوسرے

یں اس کو کسی نہ کسی مادی پیکر کے روپ میں دیکھتے ہیں، ایک پر اسلامی تعلیمات، صوفیاے کرام اور بجربانی اور ناتھ پنتھی جماعتوں کے اثرات کے ساتھ ویدانت کے فلسفہ کا اثر ہے، اور دوسرے پر خالص وشنوی نظریے کی چھاپ، یہاں ہم بھگت کال کی شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کرینگے، پہلا سنت کاویہ دوسرا وشنو کاویہ اور تیسرا صوفی کاویہ۔

سنت کاویہ | سنت کاویہ نے بودھوں اور ناتھ پنتھیوں کے خیالات کی اشاعت کی اور روحانیت پر خاص طور سے زیادہ زور دیا، اس کا سلسلہ یوں تو کبیر کے بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا، لیکن کبیر کو ہی اسکا محرک سمجھا جاتا ہے، سنت شعرا نرگن ایشور کے اپاسک ضرور ہیں لیکن انکا نرگن بودھوں کے شونیہ سے مختلف ہے، انھوں نے گیان کو خدا کی قربت حاصل کرنیکا پہلا زینہ قرار دیا ہے لیکن گیان کے ذریعہ اس اعلیٰ طاقت کو جان لینے کے بعد اسکے تقرب کا ذریعہ انکے نزدیک صرف بھکتی ہی ہے، سنت شعرا بلند پایہ عامل تھے، ان کی زبان نے روحانیت کی بڑی خوبی سے اشاعت کی ہے، روحانی وصل اور فراق کی اتنی خوبصورت اور دلکش تصویریں اس سادگی کے ساتھ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں مشکل سے ملیں گی، ان شعرا نے سادھنا کے نمائشی طریقوں کا مذاق اڑایا ہے اور بنیادی، اخلاقی اور روحانی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، سنت شعرا نے ایک ایسا ترانہ چھیڑا جو سماجی بندھنوں اور مذہبی قیود سے آزاد ہوکر عوام کے دل کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس ترانے میں سب سے بلند اور پر اثر آواز کبیر کی ہے،

سنتوں کی شاعری کا خاص موضوع خدا سے وصل، اس سے تعلق، مختلف قسم کے تاثرات کا اظہار، اس کے نام کی تسبیح و تقدیس، نفس کی قربانی، صالح زندگی کی اہمیت اور پند نصائح وغیرہ ہیں، ابتدا میں سنتوں نے نہ تو اپنے کلام کو قلم بند کرنے کی کوشش کی اور نہ تو اس کی نوک پلک درست کرنے کی طرف توجہ کی، وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے تھے اس کا اظہار کر دیتے تھے، بعد میں ان کو اپنی تخلیقات قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور وہ متفرق اشعار کے مجموعوں کے علاوہ ایسی تصنیفات

بھی کرنے لگے جس میں ان کے اصولوں کی تشریح ہوتی تھی، سنت سندر داس کی گیان سمدر اسی طرح کی ایک تصنیف ہے، گرو گوبند جی نے بعض مشہور سنسکرت تصانیف کے ترجمے دوسروں سے کرائے، اور ان کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کیا، کچھ سنتوں کا رجحان صوفیوں کے انداز پر لکھی جانے والی پریم گاتھاؤں کی طرف بھی تھا، بابا دھرنی داس کی پریم پرگاس اور سنت دکھ ہرن کی پہپاوتی اسی طرح کی تصانیف ہیں،

سنتوں کی شاعری میں پدوں اور ساکھیوں کو خاص مقام حاصل ہے، ساکھیوں کی شکل زیادہ تر دوہوں کی سی ہے، ساکھی کا لفظ غالباً سنسکرت لفظ ساکچھی کا اپبھرنش ہے، جس کے معنی گواہ کے ہیں، چنانچہ سنتوں کی ساکھیوں میں ان کے ذاتی تجربوں کی جھلک ہے، کبیر پنتھ کی مستند تصنیف بیجک میں ہے کہ

ساکھی آنکھی گیان کی سمجھ دیکھ من مانہ

بن ساکھی سنسار کا جھگرا چھوٹت نانہ

جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے سنتوں کی ساکھیاں زیادہ تر دوہا چھند ہی میں پائی جاتی ہیں، جو نہایت قدیم چھند ہے، دوہا کا ماخذ سنسکرت لفظ دوگدھک کو کہا جاتا ہے، پراکرت پنگلم کے شرح نگار نے اس کی اصل دوپدا بتلائی ہے، قدیم اپبھرنش میں اس چھند کا استعمال کم ملتا ہے، غالباً سدھ شاعر سرہپا نے سب سے پہلے اسے استعمال کیا، اسے کبھی کبھی دوہرا بھی کہا جاتا ہے، اس میں ماتراؤں کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے:

۶ + ۴ + ۳ - ۶ + ۴ + ۱ = ۲۴

۶ + ۴ + ۳ - ۶ + ۴ + ۱ = ۲۴

اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں،

سنتوں کی ساکھی سنگرہ مختلف عنوانات پر مشتمل ہیں، جن میں زیادہ تر گورودیو کو انگ، سمرن کو انگ، پرچا کو انگ، سورا تن کو انگ وغیرہ ملتے ہیں، لفظ انگ کبیر نے علامت خصوصی

کے طور پر استعمال کیا ہے ؎

نر دیری سنہ کا متا سائیں سینی نیہ

دشیا سو نیارا رہے سنت نما انگ ایہ

ساکھی لکھنے والوں نے مذکورہ بالا عنوانات سے مختلف موضوع روشناس کرائے، یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کبیر کی ساکھیاں پہلے ہی سے اس طرح تقسیم تھیں یا بعد میں کی گئیں لیکن داؤ دیال کی ساکھیوں میں پہلے یہ ترتیب نہیں تھی، ان کی ساکھیوں کو پہلی مرتبہ ان کے شاگرد رجب نے مرتب کیا، رجب نے اسکے علاوہ ایک اور اہم کام یہ کیا کہ ان کے پدوں کو بھی مختلف عنوانات کے ماتحت ان کا مجموعہ کلام "انگ بدھو" کے نام سے مرتب کر دیا۔

سنت شعراء کے کلام کا ایک بڑا حصہ دوہوں اور چوپائیوں کی شکل میں بھی پایا جاتا ہے، یہ دونوں بہت قدیم ہیں، لیکن جس طرح کبیر نے رمینی میں چند چوپائیوں کے بعد دوہے نظم کیے ہیں، وہ سویم بھو کی اپجرنش راماین میں بھی ہیں، جو سمبت آٹھ سو کرمی کے قریب کی تصنیف ہے، چوپائی چھند کا استعمال گرو گورکھناتھ کی جانب منسوب تصنیف پران سنکلی میں بھی ہوا ہے، چوپائی ہندی شاعری کا نہایت مقبول اور ہر دلعزیز چھند ہے، اس میں دو مصرعے اور ہر مصرعے میں سولہ ماترائیں ہوتی ہیں، اور آخر میں جگن اور تگن کو مانع قرار دیا جاتا ہے، تلسی داس نے ان اصولوں کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا ہے، تلسی کے علاوہ جیند جائسی، سور سندر اور نند داس وغیرہ کے یہاں اس اصول کی پابندی نہیں ملتی، ویسے کبیر داس کی رمینی دوہوں اور چوپائیوں کے سلسلہ میں خاص اہمیت کی حامل ہے، رمینی میں کبیر کا انداز پربندھ کابیہ کے لیے زیادہ مناسب ہے، پربندھ کابیہ مختلف ابواب میں تقسیم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک پوری کہانی ہوتی ہے، اسے مثنوی کے قریب سمجھنا چاہیے، آچاریہ رام چندر شکل پربندھ کابیہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں زندگی کا مکمل عکس

ہوتا ہے اور واقعات کی مسلسل کڑیوں کے ساتھ دلکش مضامین کی آمیزش ہوتی ہے،

اس طرح کے دوہوں اور چوپائیوں کا تجربہ کبیر داس نے اپنی ایک دوسری تصنیف گرنتھ باونی میں بھی کیا ہے، سکھوں کی مستند کتاب آدی گرنتھ میں اس کا نام باون اکھری ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے اشعار ناگری رسم الخط کے سولہ سوروں اور چھتیس بینجنوں کے مطابق ہیں، اس میں خاص طور سے دوہے اور چوپائی چھند ہی استعمال ہوئے ہیں لیکن کوت چھپے سویا اور کنڈلی چھند بھی موجود ہیں ان چھندوں کا مروج نام کبت گھنا کچھری ہے، اس میں چار ہم قافیہ مصرعے اور ہر مصرعے میں سولہ اور پندرہ یعنی اکتیس حروف ہوتے ہیں، چھپے چار مصرعوں کا ایک غیر معمولی چھند ہے جو رولا (۱۳ + ۱۱ ماترائیں) اور الالا (۱۳ + ۱۵ ماترائیں) چھندوں کے دو دو مصرعوں کے میل سے بنتا ہے، سویا بائیس سے چھبیس حرفی مصرعے والے چھند کو کہتے ہیں، اور کنڈلیہ چھ مصرعوں کا چھند ہوتا ہے، جس کے پہلے دو مصرعے دوہا چھند کے اور باقی چار رولا چھند کے ہوتے ہیں، اس طرح اس کے ہر مصرعے میں چوبیس ماترائیں ہوتی ہیں، اس میں دوسرے مصرعے کا آخری نصف حصہ تیسرے کے پہلے نصف حصہ میں دہرایا جاتا ہے، اور پہلے مصرعے کا پہلا لفظ آخری مصرعے کا آخری لفظ ہوتا ہے، مثال کے طور پر علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی کا ایک عربی کنڈلیہ ملاحظہ فرمائیے:

یا من حار بقلبہ مشغوف الاموال — غد اعلی اہل الہدی مفتخرا بالمال

مفتخرا بالمال بری اسباب الدنیا — باقیۃ فی الدھر ما دری نضق الدنیا

اذکر یوم الموت یوم لا یجدی المامن — بادر قبل الفوت الی اصلاحک یا من

حروف کے یہ تجربے محض ناگری رسم الخط تک ہی محدود نہیں بلکہ سنتوں نے اسی طرح عربی اور فارسی خط کے حروف کا بھی استعمال کیا ہے، سنت شعراء کے الف نامے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں،

بلّے شاہ اور باری صاحب کے الف نامے خاص طور پر مشہور ہیں، خود کبیر نے بھی الف نامہ لکھا ہے، جس کا ایک نسخہ آزاد لائبریری علی گڈھ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، دوسری لائبریریوں میں بھی اس کے نسخے ملتے ہیں، اس کے باوجود ہندی کے محققین اسے کبیر کی تصنیف تسلیم نہیں کرتے، سنت شعراء کے بارہ ماسے بھی قابل ذکر ہیں، سکھوں کی مستند کتاب "آدگرنتھ" میں اس طرح کی شاعری کو بارہ ماسا کہا گیا ہے، جن میں گرو ارجن دیو نے چیت سے پھاگن تک کے ہندی مہینوں میں کیے جانے والے کاموں سے متعلق نصیحتیں کی ہیں، سنت گلال اور سنت بھیکہ صاحب کے بارہ ماسے آشاڑہ سے شروع ہوتے ہیں۔

سنتوں کی شاعری میں رمزیت کا پہلو

جب ذاتی تاثرات اور وجدانی کیفیت کی ترجمانی الفاظ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں تو شاعری میں رمزیت آجاتی ہے، ذاتی تاثرات اور وجدانی کیفیت سے ہماری مراد وہ کیفیت ہے جس میں ہم خود کو پاکر بھی اپنے کو بالکل بھول جاتے ہیں، جس کی وضاحت غالب کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ورہدارنیک اپنشد میں اس غیر معمولی کیفیت کا ذکر محب اور محبوب کے ہم آغوش ہونے سے کیا گیا ہے، اور اسے تمام دوسرے تجربوں کو دبا دینے والا بتایا گیا ہے۔

तद यथा प्रियया स्त्रा सम्परिष्वक्तो न बाह्यं किंचन
वेदनान्तर मेवायं पुरुषः प्राज्ञेनात्मना सम्परिष्वक्तो न बाह्यं
किंचन वेदनान्तरं तद वा अस्यै तद्‌ प्रकाम आप्तम काम मकाम
रूपम शोकान्तरम ।।

اس کیفیت یا اعلیٰ حقیقت کا احساس ہو جانے پر بھی اس کی ترجمانی پوری پوری نہیں کیجا سکتی ہے، سنت شعراء اسے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے اور ایک ہی بات کو بار بار دہرایا ہے، اس کے باوجود جو کہنا چاہتے ہیں نہیں کہہ پائے ہیں، اسی لیے ان کے خیالات نہایت دقیق ہو گئے ہیں، سنت کبیر صاحب نے اس کیفیت کو اس طرح نظم کیا ہے:

ادگت اکل انوپم دیکھیا کہت کہیا نہ جائی
سین کرے من ہی من رہسے گونگے جانی مٹھائی

(کبیر گرنتھاولی پد ۶ صفحہ ۹۰ پہلا ایڈیشن)

کبیر کہتے ہیں اپنے محسوسات کی ترجمانی کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے گونگے شخص سے مٹھائی کی لذت پوچھی جائے اور وہ اشاروں میں بتا کر دل ہی دل میں خوش ہو، سنت روی داس کے قول کے مطابق اس کیفیت سے ایسا سکون اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ اس اعلیٰ حقیقت سے متعلق بھجن وغیرہ کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، وہ ایک مقام پر کہتے ہیں:

گائی گائی اب کا کہی گاؤں گاون ہار کو نکٹ بتاؤں
جب لگ ہے یا تن کی آسا تب لگ کرے پکارا
جب من ملیو آس نہیں تن کی تب کو گاون ھارا
جب لگ ندی نہ سمد سماوے تب لگ بڑھے ہنکارا
جب من ملیو رام ساگر میں تب یہ مٹی پکارا
جب لگ بھگت مکت کی آسا پرم تتو میں گاوی

(ریداس جی کی بانی بیلو یڈیر پریس الہ آباد پد ۳۰ ص)

(مطلب): میں اب بار بار کیا گاتا رہوں، اور کس کا نام لیکر گایا کروں، اب تو میں نے اس کو نمایاں طور پر محسوس کرلیا، جب تک وہ اس جسم کی آرزو بنی رہی اس وقت تک گیت بھی چلتا رہا،

جب دل وجدانی کیفیت سے معمور ہوگیا تو اب گانے والا کون رہ جاتا ہے، ندی جب وقت تک سمندر تک نہیں پہنچی شور مچاتی ہوئی پریشان حال بڑھتی جاتی ہے، لیکن جب یہ من روپی ندی

رام روپی سمندر میں جذب ہوگئی تو اس کی چیخ بھی بند ہوگئی،

سنتوں کا رمزیہ کلام اس قسم کے تاثرات سے بھرا ہوا ہے،

سنتوں کے ازدواجی تاثرات سنتوں کا محبوب ترین پرتیک ازدواجی تاثر یا بیوی اور شوہر کی محبت ہے، جسے ہندی زبان میں دامپتیہ پریم (दाम्पत्य प्रेम) کہتے ہیں سنتوں سے قبل بھی ان تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے، دکنی بھارت کی مشہور شاعرہ گوداکی شاعری اس کی دلکش مثال ہے، راجستھان کی عالمگیر شہرت رکھنے والی شاعرہ میرا بائی کی بھکتی بھی اسی درجہ کی ہے، اور بادری صاحبہ کی سادھنا بھی ایسے ہی تاثرات کا نتیجہ ہے، اس پرتیک (Symbols) کو نرگن اور سگن دونوں سنتوں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ قبول کیا ہے، نرگن مسلک کے سنتوں نے محبوب کو ہر جگہ موجود جان کر بغیر کسی تفریق کے اپنے اندر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے مقابلہ میں سگن مسلک کے سنت اسے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس کے اور اپنے درمیان تفریق کے ساتھ اس کی قربت حاصل کرنے کے خواہاں رہے ہیں،

ازدواجی تاثرات سے متعلق سنتوں کا مذکورۂ بالا نظریہ صوفیوں کے خیالات سے مل جاتا ہے، صوفی شعرا بھی خود کو نرگن اسکول ہی میں شمار کرتے تھے، اپنی محبت کو عشق حقیقی سمجھتے تھے، اور اپنے تاثرات کو زیادہ اثر انگیز بنانے کے لیے سنتوں کی طرح اسے شخصیت کا جامہ پہنانا ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس پرتیک کا خاکہ ان کے یہاں سنتوں سے مختلف تھا، سنتوں نے اپنے محبوب کا تصور مرد کی شکل میں کیا ہے، اور اپنے کو بیوی مان کر اس کے قریب آنا چاہتے تھے، لیکن صوفی شعرا نے اس کے برعکس اسے اپنی محبوبہ بنا کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے، سنت شعرا نے ہندوستانی روایات

کی تقلید کی اور صوفیوں نے ایرانی اصولوں کو اپنا آدرش قرار دیا،

سنتوں کے نظریے کے مطابق فطرۃً صرف خدا ہی مرد یا پرش ہے، اور دوسرے سب انسان اس کی بیویاں ہیں، داؤ دیال کا ایک شعر ملاحظہ ہو

پرش ہمارا ایک ہے ہم ناری بہو انگ
جے جے جیسی تاہیوں کھیلے تیسی ہی رنگ ॥ ۵۷ ॥

داؤ دیال کی بانی (انگ بدھو) صفحہ ۳۴

نانک نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ محض وہی ایک پرش ہم لوگوں کا پریتم ہے، اور وہ جس پر اپنی چشم کرم ڈالتا ہے وہی سہاگن کہلا سکتا ہے ؎

بھنت نانک سبھنا کا پیو اکیو سوئی
جسنو ندر کرے سا سہاگن ہو ئی

آدی گرنتھ (گرو گرنتھ صاحب جی کھالسہ پریس امرت سر) ص ۳۵۱

سنتوں کی شاعری میں گرو کا مقام گرو کی مدح و توصیف ہندوستانی روایات کا نمایاں جز ہے، ہندوستانی سماج میں زمانۂ قدیم سے گرو کو نہایت بلند مقام حاصل ہے، اور وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، وہ مذہب اور سماج دونوں کا ناظم تھا، سیاسی مسئلوں کا حل بھی وہی کرتا تھا، سنسکرت ادب میں گرو کی عظمت کے بہت سے اشلوک ملتے ہیں،

ہندوستانیوں کا عقیدہ تھا کہ گرو ہی ماتا ہے اور گرو ہی پتا حتی کہ خدا بھی گرو ہی ہے، اسلیے اس کی خدمت دل، زبان اور عمل سے ضروری اور واجب ہے، گرو کی توجہ ہی سے اچھی اور نیک چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

گرو پتا گرو مار پتا گرو دیو ادشیہ
کرمنا منسا باچا تسما تیبھہ پرسیوتیے

(گھر نڈ سمفتا تیو یدیش شلوک ۱۶)

ہندی ادب کی ابتدا سے ناتھ پنتھیوں کی پیدائش تک گرو کی مدح کی صرف چند مثالیں ملتی ہیں، بھکتی مت میں گرو کی توصیف ہندی شاعری میں سدھ اور جین شعراء کے یہاں ملنا شروع ہوتی ہے، سنتوں کی بانیاں سچے گرو کی توصیف سے بھری ہوئی ہیں، انھوں نے عوام کے ذہن کو گرو کی طرف پھیرنے کے لیے بڑی کوششیں کی ہیں، سچے گرو کی تعریف وہ بار بار کرتے ہیں، پھر ان کو سیری نہیں ہوتی، اور وہ اپنا دل نکال کر رکھ دینے کے خواہشمند رہتے ہیں، وہ گرو کو گووند یعنی خدا سے بھی زیادہ درجہ دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ گرو اور گووند میں ایک نمایاں فرق ہے، ایک بذات خود مکمل، روشن، جامع اور لامحدود ہے، دوسرا نامکمل کو مکمل کرتا ہے، نفس اور روح کو پہچانتا ہے، اور اس اعلیٰ ذات کے وجود کو روشن کرتا ہے، ایک راز ہے اور دوسرا راز داں ظاہر ہے کہ راز کے مقابلہ میں راز کے انکشاف کرنے والے کا درجہ بڑا ہوگا، کبیر کا ایک دوہا ملاحظہ فرمائیے ؎

گرو گووند دوؤ کھڑے کاکے لاگوں پائے
بلہاری گرو آپ کی گووند دیو بتائے

کبیر کا خیال ہے کہ خدا اگر روٹھ بھی جائے تو گرو نجات اور مغفرت کی کوئی اور راہ نکال سکتا ہے، لیکن اگر گرو روٹھ جائے تو کسی اور کا سہارا ملنا مشکل ہے، اسی لیے وہ بار بار ایک ہی بات دہراتے ہیں ؎

گرو بڑے گووند تے من میں دیکھ بچار
ہری سمرے سو بار ہے گرو سمرے سو پار

(سنت بانی سنگرہ جلد اول صفحہ ۲/۱۳)

سنت سندر داس نے گرو ہی میں خدا کے اوصاف دیکھے اور انھیں گرو کے روپ میں برہم

کا احساس ہوا ہے ؎

سندر ست گرو برہم ہے پرسکھ کی سم درشٹ
سو دھی اور نہ دیکھئی دیکھے درپن درشٹ

دولن داس نے گرو بھجن کی طرف خاص توجہ کی ہے اور اس سے متعلق نصیحتیں کی ہیں، ان کی نظر میں گرو میں برہما، وشنو اور مہیش سبھی کے اوصاف موجود ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

گرو برہما گرو وشنو ہے گرو شنکر گرو سادھ
دولن گرو گووند بھلو گرو مت اگم اگادھ

چرن داس نے سندر داس اور دولن داس سے بھی زیادہ گرو کو درجہ دیا ہے، انھیں گرو کی مثال تینوں لوک میں نہیں ملتی، ان کا عقیدہ ہے کہ گرو کا نام لیتے ہی سارے گناہ دھل جاتے ہیں، اور دھیان کرتے ہی دھیان کرنے والا خود خدا میں ضم ہو جاتا ہے ؎

گرو سمان تہوں لوک میں اور نہ دیکھے کوئی
نام لیے پاتک نسے دھیان کیے ہری ہوئی

پلٹو صاحب نے گرو کو سب دیوتاؤں کا دیوتا تسلیم کیا ہے ؎

وہی دیوا کو پوجے سب دیون کو دیو
پلٹو واہی بھکتی جو سدگرو اپنا سیو

ان سنت شعراء نے گرو کے لیے عجیب و غریب الفاظ اور اصطلاحیں تراشی ہیں، یہ اصطلاحیں بہت ہی پُرمعنی اور خوبصورت ہیں، کبیر نے گرو کو کمہار، امرت کی کھان اور سورما کے القاب سے یاد کیا ہے، سندر داس نے سنار، دریا صاحب نے جہاز اور کھیوٹ، دولن داس نے چاند، چرن داس نے تنکاری اور ناوک، سہجو بائی نے رنگریز اور غریب داس نے پارس وغیرہ

کا استعمال سچے گرو کے لیے کیا ہے۔ ان لفظوں میں کچھ گرو کی طبیعت اور مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں اور کچھ اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سنتوں کی تنبیہ یا چیتاونی کسی چیز یا کسی شخص سے ہوشیار رہنے کے حکم یا پیغام کو تنبیہ کہتے ہیں، سنتوں کی شاعری اس قسم کی تنبیہوں سے بھری ہوئی ہے، ان میں دنیائے فانی اور مایا کے فریب کی جانب خاص طور سے توجہ کی گئی ہے اور ان سے ہوشیار رہنے کی تعلیم دی گئی ہے، چیتاونی لکھنے کا سلسلہ ہندی ادب میں بہت قدیم ہے، سرہپا نے پاکھنڈ اور واہیاڈنبر کا مذاق اڑاتے ہوئے ان سے دور رہنے کی مختلف مقامات پر تنبیہ کی ہے، سویمبھو کے یہاں بھی دنیاوی بندھنوں اور رشتوں کے وقتی اور فانی ہونے کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔

دسویں صدی کے دیوسین اور نلوپا وغیرہ شعرا نے بھی تیرتھ اور دیوسیوا وغیرہ کو بیکار اور بے سود بتا کر ان سے دور رہنے کی تنبیہ کی ہے، آگے چل کر گورکھناتھ کی شاعری میں چیتاونیوں کی اور بھی دلکش مثالیں ملتی ہیں، ناتھوں کی شاعری سے جہاں اور بہت سی چیزیں سنتوں کی شاعری میں داخل ہوئیں، تنبیہ بھی خوبصورت لباس میں سنتوں کے کلام میں چھا گئی، سنت شعرا کی چیتاونی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، (۱) روحانی معاملات اور (۲) سماجی مسائل۔

سماجی مسائل کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک ترغیبی، دوسرا ترہیبی، روحانی معاملات کے ذیل میں شعرا نے ترہیبی چیزوں کی جانب زیادہ توجہ دلائی ہے، مثلاً بری صحبت، غصہ، حرص و ہوس، غرور، بغض، پیاس، مایا، دولت عورت، تیرتھ، نشہ اور دنیا کی فنا وغیرہ کو، سنتوں نے روحانی چیتاونی کے ذیل میں رکھا ہے، سماجی چیتاونیوں میں بھی سنت شعرا نے ترغیبی چیزوں کے بجائے ترہیبی کی جانب زیادہ توجہ دلائی ہے، چنانچہ، تفرقہ، قربانی، تنتر منتر، خود غرضی، حصا، ثروت ہونے کی خواہش وغیرہ اس کے اہم موضوع ہیں۔

بیشتر سنت شعرا نے زر اور زن کی طرف سے لوگوں کو ہشیار کرنے کی زیادہ کوشش کی ہے اور اسی محدود دائرے میں ان کا بیشتر کلام چکر لگاتا رہتا ہے، لیکن کبیر اور ان کے بعد کے شعرا نے ان روایتی موضوعات سے ہٹ کر دوسرے موضوعات و مسائل میں بھی اپنے تاثرات کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے، کبیر، دادو اور ملوک داس کی ایک ایک چیتاونی ملاحظہ ہو:

میں بھنورا توہی برجیا بن باس نہ لیئہ
اٹکیگا کھوں بیل سے تڑپ تڑپ جیہ دیئہ

(کبیر داس)

آپا پر سب دور کیر رام نام رس لاگِ
دادو اوسر جات ہے جاگ سکے تو جاگِ

(دادو)

دیہی تو بہ نہ آپنی سمجھ پری ہے موہِ
اب ہیں تے تج راکھ توں آکھر تج ہیں توہ

(ملوک داس)

سنت کا بیہ میں شونیہ شونیہ یا خلا کے معنی ہیں ابھاؤ یعنی غیر موجودگی عدم، کسی چیز کا نہ ہونا، جس کا وجود نہیں ہے، یا جو نظروں سے اوجھل ہے، سنتوں نے دنیا میں رام اور نام کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو شونیہ بتایا ہے، ان کا خیال ہے کہ دنیا کی ساری چیزیں جہل اور مایا سے لپٹی ہوئی ہیں، شونیہ کا تصور سنتوں کے ادب میں بودھوں سے ماخوذ ہے، 'شو' اور 'نیہ' الفاظ سے مرکب شونیہ اپنی ظاہری شکل میں تقریباً سبھی کے یہاں موجود ہے، لیکن اس کی روح کو مختلف اداروں نے اپنے مزاج اور مذاق کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ناتھ فرقہ میں شونیہ کا استعمال بہت ہے، گورکھ ناتھ کے یہاں شونیہ کا ایک استعمال ملاحظہ ہو،

بستی نہ سونیم سونیم نہ بستی اگم، گوچر ایسا!
گگن سکھر منہ بالک بولے ناکا نام دھر ہوگے کیسا

(گورکھ بانی صفحہ ۱)

ناتھوں کے یہاں شونیہ لفظ ایشور کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن سنتوں کے یہاں اسکا استعمال خدا کے غیر مادی وجود کے ساتھ "سہستر دل کمل" کے لیے بھی ہوا ہے، شاید اس لیے کہ خدا کا مسکن بوگیوں کے "سہستر دل کمل" کو قرار دیا ہے، اور خدا چونکہ ان کے نزدیک شونیہ ہے اس لیے اس کا مسکن بھی شونیہ ہی ہے، شونیہ کا استعمال "سہستر دل کمل" کے لیے کرنے والوں میں کبیر داس، چرن داس دھرنی داس، بھیکھا، تلسی صاحب، دسے داس اور دھرم داس کے نام قابل ذکر ہیں، خدا کے غیر مادی وجود کے لیے شونیہ کا استعمال یاری صاحب، غریب داس، بھیکھا، دیا بائی، سہجو بائی، پلٹو صاحب اور تلسی صاحب وغیرہ کے یہاں ہوا ہے۔ اور یاری صاحب نے سن (سہستر دل کمل) کو بہت ہی واضح طور پر خدا کی قیام گاہ بتایا ہے،

من کے مقام میں بیچوں کی نسانی ہے
جگمگ رہ وج سوئی انحد بانی ہے

سنتوں کے لوک گیت لوک جیون یا عوام کی زندگی کی دلچسپ اور اثر انگیز تصویریں ہر ملک کے لوک گیتوں میں نظر آتی ہیں، اس لیے ان میں ایک خاص شیرینی پائی جاتی ہے، ان گیتوں میں جنتا کی خاموش زبان بولتی نظر آتی ہے، اور اس کے دل کی دھڑکنیں لفظوں میں سنائی دیتی ہیں اس لحاظ سے لوک گیتوں کو پاکیزہ، شیریں اور پُرخلوص محبتوں کا ایک صاف و شفاف آبشار کہا جا سکتا ہے، اس لیے رنج و غم، موسم، جشن، میلوں اور شادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر عموماً

عورتیں لوک گیت گاتی ہیں،

سنت شعرانے چونکہ خود کو ناری مانا ہے اور لوک گیت زیادہ تر عورتیں ہی گاتی ہیں، اس لیے سنتوں کی شاعری میں لوک گیت کثرت سے پائے جاتے ہیں، بھوج پوری کا ایک لوک گیت ملاحظہ ہو،

سوتل رہوں اوسروا ہو گروجی دیلے جگائی	گونا کے دن نیرا گھلے ہو من گئیل گھبرائی
گروجی ہو گروجی بچاریں ہو گروجی سرن توہار	ربح ایک دہ تو جکموا ہو گھورل کیریاہ تو دان
کو ٹھل بھرل باٹو جیوُرا ہو گروجی کئی ائی تو دان	ربح ایک دہ تو جکموا ہو گروجی کئی ائی تو دان

اس لوک گیت میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی گئی ہے جو اپنے 'اوسارے' میں بے سدھ سو رہی تھی، کچھ ہی دیر میں گروجی نے اس کے قریب آکر اس کو اس کی رخصتی کی خبر دی، لیکن وہ دنیا کی خوبصورتی میں اس قدر کھو گئی ہے کہ اسے اصل منزل کا بھی خیال نہیں رہ گیا ہے، وہ یہ بھول گئی ہے کہ یہ دنیا محض آگے بڑھنے کا ایک زینہ ہے، یہاں مستقل طور پر بیٹھکر خوشیاں منانے کا موقع نہیں، اس لیے گہری نیند سے جگانے کے لیے گرو ہی سب سے زیادہ موزوں ہے، اس ردیک میں ناری نفس کی علامت ہے اور رخصتی سے موت کا وقت مراد ہے۔

(باقی)

ابو العلاء معری اور اسکا فلسفہ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۳)

فلسفۂ الٰہیات الٰہیات میں سب سے پہلی بحث خدا کے وجود کی ہے، ابو العلاء خدا کو اس کی تمام صفتوں کے ساتھ مانتا تھا، اور شرک اور بت پرستی وغیرہ ان تمام چیزوں کا شدید مخالف تھا جن سے توحید میں فتور پیدا ہوتا ہو، ذیل میں اس کے بعض خیالات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

وجود باری پر عقیدہ "اللہ کا وجود بالکل برحق اور ثابت ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں، وہ پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی، اس کی ذات برحق کے بارہ میں جو شبہہ کرتا ہے وہ قابل ملامت ہے، خدا کو جھٹلانے والے بڑے نادان ہیں، مجھے فخر ہے کہ میں اس کا قائل ہوں منکر نہیں، اور جو بھی غور و فکر سے کام لے گا وہ خدا کے وجود برحق کا انکار نہیں کر سکتا، قدرت الٰہی کے جلوے اسے ہر طرف نظر آئیں گے، کیا انسان کو خود اپنی ذات کے اندر وجود باری کے روشن اور واضح نشانات نہیں ملتے،

توحید وجود باری کے ساتھ اس کو توحید پر بھی کامل اعتقاد تھا، چنانچہ لکھتا ہے:

"خدائے علیم کی وحدانیت کو ماننا ہمارا مذہب ہے، خدا ایک ہے، اس لیے تم بھی وحدت اختیار کرو، وہ اپنی شہنشاہیت میں اکیلا ہے، کسی حال میں بھی اس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں مجھے اللہ واحد نے پیدا کیا، تم سب ایک کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور مغفرت طلب کرو"

توحید کی طرح وہ اللہ ہی کو معبود حقیقی اور لائق عبادت سمجھتا تھا، اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ کی عبادت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

وہ خدا کے تمام صفات علیم، قدیر، مجید، حکیم، خالق، رزاق، عادل منعم، قہار، ملک، جبار، کبیر، الملک، مختار، خبیر، لطیف، باقی، قدیم، مشکل کشا، مجوز، مہیمن، محیط وغیرہ کا ذکر کرتا ہے، اس کے نزدیک کائنات کی ساری چیزیں خدا کی مخلوق اور اس کے قبضہ و اختیار میں ہیں، وہ پوری کائنات کا علی الاطلاق بادشاہ اور حاکم ہے، اور تمام اشیاء طبعی طور پر خدا کی عظمت و جبروت کے سامنے سرافگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہیں،

ابطال شرک توحید کے اقرار کے ساتھ شرک کا ابطال اس طرح کرتا ہے:

"اللہ اپنے اقتدار میں منفرد ہے، کسی حال میں اس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں، دنیا میں تمھارے جیسے تو بہت سے لوگ ملیں گے لیکن تمھارے خداوند کا کوئی مثیل نہیں، اسکی عزت و کبریائی میں کوئی شبہہ نہیں، کوئی دوسرا اس کے ملک و اقتدار میں شریک نہیں، انسان جہالت کی بنا پر ملک کو اپنا بتاتا ہے، اس کا آقا وہی مولیٰ ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں، رات کی تاریکیوں میں اس کے علاوہ کسی سے التجا نہ کرو، بہت سی چیزیں طبعاً و صورۃً ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں، لیکن تیرے خداوند کا کوئی شبیہ نہیں۔"

وہ اللہ تعالیٰ کو ہر نقص و عیب سے پاک مانتا ہے، اس کے نزدیک خدا کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

عقیدۂ آخرت توحید کے بعد اسلام کا دوسرا اہم اور بنیادی عقیدہ آخرت کا ہے، اس کے متعلق بھی ابو العلاء کے خیالات صاف اور واضح ہیں، وہ ثواب و عقاب، دنیا و آخرت، دوزخ و جنت اور حشر و نشر سب کو مانتا ہے، اور خود روز جزا کی ہیبت اور محاسبۂ الٰہی سے

نہایت خوفزدہ ہے، رسالت کے منکر کی تردید و مذمت کرتا ہے۔ اس کے اس قدر واضح تصورات کے باوجود بھی اس کو آخرت اور روز جزا کا منکر کہنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔

نبوت اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ رسالت ہے، ابو العلاء کے بعض شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رسالت کا قائل نہ تھا، یا کم از کم اس کا استخفاف کرتا تھا، لیکن اس کے مجموعی خیالات سے اس کی تردید ہوتی ہے، ایک جگہ کہتا ہے:

"نبی لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے حق کے ساتھ مبعوث ہوا ہے، اس لیے تم کو اپنی تہذیب اصلاح کا فکرمند ہونا چاہیے"۔

اس کے دیوان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے جس میں رسول اکرمؐ کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے، اور آپ کی بعض اہم اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، اس کا مطلع و مقطع حسب ذیل ہے:۔

دعا کم الی خیر الامور محمد　　ولیس العوالی فی القنا کالسوافل

فصلی علیہ اللہ ما ذر شارق　　وما فت مسکا ذکرہ فی المحافل

وہ قرآن مجید کو بھی برحق مانتا تھا۔

تقدیر تقدیر پر اس کا نہایت راسخ عقیدہ ہے اور اس کے نزدیک قضائے الٰہی اور مقدر کے سامنے سب کو عاجز اور بے بس ہو جانا پڑتا ہے، تقدیر کے متعلق کہتا ہے کہ "اس سے فرار گناہ اور برائی ہے، ہم کو ہلاکت کا ڈر لگا رہتا ہے، حالانکہ ہر چیز نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے"، اس کے بعض خیالات سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ جبر کا قائل ہے، حالانکہ وہ جبریہ نہ تھا، مثلاً "ہم طائر قفس کی طرح دنیا میں مجبور ہیں، اور قید و بند سے رہا ہونا ہمارے لیے مشکل ہے، جب ہماری زندگی اور موت، پیدائش اور پیری کچھ بھی ہمارے بس میں نہیں تو ہم مختار کس بات کے، دنیا کے تمام لوگ

محتاج و غلام ہیں اور بلاشبہہ غلام مالک و مختار نہیں ہوتا۔

اس نے نہایت تفصیل سے اس کو واضح کیا ہے کہ انسان کا عیش و عشرت یا رنج و زحمت، یسر یا عسر اور رزق وغیرہ سب قسمت اور مقدر سے چلتا ہے۔

ملائکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابو العلاء، جنات اور ملائکہ کا قائل نہیں تھا، حالانکہ وہ کہتا ہے: "انسان و حیوان فرشتوں سے کمتر درجہ کی مخلوق ہیں، اور جن لوگوں کا دل خشیت الٰہی اور تقویٰ کی دولت سے پاکیزہ ہو گیا ہو وہ انسان نہیں فرشتے ہیں، مخلوقات الٰہی میں پہلا درجہ فرشتوں کا، دوسرا انسانوں کا اور تیسرا حیوانوں کا ہے، لیکن انسان اپنے عزم و بلند حوصلگی اور عبادت و اطاعت سے فرشتوں کا ہم مرتبہ اور سرکشی و بغاوت سے جن عفاریت بن جاتا ہے"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق مانتا تھا، رہا یہ شعر:

قد عشت عمراً طویلاً ما علمت بہ　　حساً یحس لجنی ولا ملک

تو اس میں جن و ملک کے محسوس و مرئی ہونے کی نفی ہے، جو صحیح بھی ہے، ان کے وجود کے انکار سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

مذہب اسلام ابو العلاء کے نزدیک سچا اور صحیح مذہب اسلام ہے، اور وہ اس کو تمام دینوں سے بہتر مانتا ہے، چنانچہ کہتا ہے:

"(یہ عجیب بات ہے کہ) جب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کا ذکر کرتا ہوں تو یہود انکار کرتے اور اپنی کتاب پیش کرتے ہیں، کیا مذہب اسلام کا بھی کوئی شخص منکر ہو سکتا ہے، جبکہ تعالیٰ خداوند نے اسی کو لوگوں کے لیے متعین اور پسند کیا ہے، اگر اسلام کی تذلیل و اہانت کا سامان پیدا ہو جائے تو یقین مانو تلاش و جستجو کے بعد بھی کسی کو ایسا دین نہیں مل سکتا"۔

اس نے دین کی اصل حقیقت، اتباع شریعت کی اہمیت، نفس پرستی کی مذمت اور دوسروں کے

گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے، اور خود بھی گناہوں کے تصور سے لرزہ براندام رہتا تھا، یہ سب باتیں اس کے دین سے لگاؤ اور تعلق کا ثبوت ہیں۔

دین اور ملت اسلام سے اس کے تعلق کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اسلامی عبادات، نماز پنجگانہ، روزہ رمضان، زکوٰۃ اور حج کے علاوہ تہجد اور نوافل تک کا ذکر کرتا ہے۔

اخلاص دین و عبادت کا تمام دارومدار اخلاص پر ہے، اسلام کی اصل روح یہی ہے، ابو العلاء نے بھی اخلاص کی تاکید، عدم اخلاص کی مذمت اور مدعیان تقویٰ اور ارباب صلاح کی پردہ دری کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی دلچسپ تنقیدوں اور زندگی کے متعلق حکیمانہ خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے انسانوں اور ان کے مختلف طبقوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا،

باطل مذاہب اور فاسد خیالات کی تردید ابو العلاء نے غلط مذہبوں (یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، تناسخ اور حلول) کا رد اور ان کے باہمی مناقشات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، وہ مسلمانوں کے گمراہ اور باطل فرقوں جبریہ، قدریہ، معتزلہ اور شیعوں کا بھی بڑا مخالف ہے۔ اور ان کے باہمی اختلافات پر اپنے غم و اندوہ کا ذکر کرتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق ابو العلاء کے اخلاقی تصورات نہایت بلند ہیں اور اس نے فضائل اعمال اور رذائل اخلاق پر تفصیلی بحث اور جزئیات تک کا استقصاء کیا ہے، اس کے نزدیک اعمال کی درستگی اور اخلاق کی پاکیزگی کے بغیر نہ تو انسان کو عزت و شرف ملتا ہے اور نہ صالح تمدن اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آتا ہے، اسی بنا پر وہ کہتا ہے: "کتنے لوگ مال و اسباب کی کمی کے باوجود اچھے کاموں اور بلند کارناموں کی بدولت معزز اور باکمال بنجاتے ہیں، حقیقت میں دنیا میں عمل خیر سے بڑا اور بہتر کوئی کام نہیں، وہ کبھی رائگان نہیں جاتا، اس لیے حسن خلق اور حسن عمل تم پر لازم ہے، اور اس کے لیے صلہ و ستائش کی ہر تمنا سے بے نیاز رہنا چاہیے، خیر و احسان کا کام اگر معاوضہ کے لیے کیا جائے تو یہ تجارت ہوگی،

اس راہ میں اگر دشواریاں اور مشکلات بھی پیش آئیں تو عزم و حوصلہ کے ساتھ ان کو انگیز کرنا چاہیے، شدائد و محن کے تحمل کے بعد ہی عزت و افتخار حاصل ہوتا ہے، بنو ہاشم کو اپنی برتر کوششوں کے نتائج شعب ابی طالب میں محصور رہنے کے بعد ہی ملے"۔

فضائل فضائل اخلاق کے سلسلہ میں اس نے سچائی، ایفاء عہد، سخاوت و فیاضی، حلم، عفوو درگذر، شجاعت و بہادری، دوسروں کی خیر خواہی، ان کو معذور سمجھنا، مخالفین کو نرمی سے جواب دینا، کسی کا احسان نہ لینا اور انتقام میں بھی اعتدال سے کام لینا (جزاء سیئة وسیئة مثلها) وغیرہ پر اپنا مفصل نقطۂ نظر پیش کیا ہے، صبر کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "صبر جمیل کی دولت جس کو مل جائے وہ بے زر ہونے کے باوجود غنی اور مالدار ہے، بے بسی اور مجبوری کا نام صبر نہیں، قدرت کے باوجود صبر کر لینا اصلی کمال ہے، جب لوگوں سے اپنے متعلق تکلیف دہ اور ناگوار باتیں سنو تو صبر سے کام لو، اس سے دشمنوں کا دل جیت سکتے اور ان کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر سکتے ہو"۔

تواضع کے متعلق کہتا ہے کہ "تواضع اختیار کرو اسی سے بلندی ملتی ہے، اگر خدا نے تم کو عزت و برتری عطا کی ہے تو متواضع بنو، اس سے عزت و شرافت میں مزید اضافہ ہوگا، خاموشی کے متعلق کہتا ہے "زیادہ باتیں کرنے والا چھوٹا سمجھا جاتا ہے اور نہ زیادہ بات چیت بکواس اور یاوہ گوئی کی دلیل ہے، اسلیے خاموشی اختیار کرو، وہ اسلیے بھی بہتر ہے کہ بات چیت سے آدمی کا سارا پول کھل جاتا ہے، زعیم ملت اور مصلح قوم بھی جب زیادہ باتیں کرتا ہے، تو اس کی مذمت کیجاتی ہے، خاموش رہنے سے انسان کے دشمن کم رہتے ہیں"۔

آداب معاشرت معاشرتی آداب کے سلسلہ میں اس نے والدین کے ساتھ حسن سلوک، بڑوں کے حقوق ادا کرنے، مہمانوں کی ضیافت و تکریم کرنے، طفیلیوں کو خوش آمدید کہنے، مسافروں، مصیبت زدوں، مسکینوں، محتاجوں، گمزدوں، بوڑھوں، بچوں، یتیموں، مظلوموں، اندھوں

اور پڑوسیوں ہر ایک کی امداد و اعانت معززین و شرفاء قوم کے ساتھ ان کے حسب مراتب برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے، بچوں کی اصلاح و تربیت کے بارہ میں لکھتا ہے: ۱۰ سال کے بچہ کو مستورات کے سامنے نہ جانا چاہیے، بچوں کو مار کر رشد و ہدایت کی تلقین کرو، نابالغ سمجھ کر ان کو نظر انداز نہ کرو، نونہالوں کو برے اور گناہ کے کاموں سے روکو، مہربان اور شفیق باپ کی تادیب اور بچہ کو سزا دینا بھی شفقت اور محبت ہی کی علامت ہے،

مجلس میں جہاں جگہ مل جائے، بیٹھ جانا چاہیے، شریف آدمی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کہاں بیٹھے،

مغنیہ عورتوں کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ، پڑوسن سے گفتگو، تاک جھانک نہ کرو، اگر کسی ضرورت سے دیوار پر چڑھو تو پہلے پڑوسی کو اطلاع کردو، راستے میں نگاہیں نیچی کرکے چلو، ادھر اُدھر نہ دیکھو، شرفاء کے لیے گھر میں رہنا ہی بہتر ہے،

رذائل | ابوالعلاء نے اسی طرح رذائل اخلاق کی مذمت و شناعت بھی کی ہے، لکھتا ہے:۔

"برے کام اور بدکلامی ترک کر دینے والا اپنے گھر کے قریب رہتے ہوئے بھی مہاجر کے برابر ہے" اور عفت و پاکدامنی اختیار کرنے والا اور برائیوں سے نفرت کرنے والا ہی اصلی دیندار ہے، ایک باعزت اور آزاد آدمی کو کم سے کم رسوائی اور بدنامی کے خوف ہی سے برائیاں ترک دینی چاہئیں"

رذائل اخلاق کے سلسلہ میں اس نے سب سے زیادہ شراب کی مذمت بیان کی ہے، اسکی شاعری میں اس کے متعلق اتنا زیادہ مواد ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے، اور اس نے خود بھی ایک مستقل رسالہ شراب کی مذمت میں حماستہ الراح کے نام سے تحریر کیا تھا،

شراب کے علاوہ بغض و کینہ، رشک و حسد، فخر و غرور، حرص و آز، شح و بخل، خیانت، جھوٹ زبان درازی، درشت کلامی، غیبت، فحاشی، بدکاری، دوسروں کی آبروریزی، عزت فروشی، ظلم و جور،

مکر و فریب، دشمنی و عداوت، بزدلی اور پست ہمتی، دوسروں کا مذاق و تمسخر اور انکی مصیبتوں پر خوش ہونے وغیرہ کے متعلق نہایت حکیمانہ خیالات ظاہر کئے ہیں،

اکثر وہ اس بات کا گلہ کرتا ہے کہ دنیا میں بدکرداری اور معائب عام اور اخلاقی قدریں فنا ہوتی جا رہی ہیں، مثلاً "افسوس دنیا سے رشد و ہدایت، حق و صداقت، صبر و احسان، مہر و وفا، خلوص و محبت، جود و سخاوت، عدل و انصاف اور خیر و صلاح عنقاء اور بیوفائی و غداری، حرص بخل، خیانت و بددیانتی، کھوٹ و کینہ، ظلم و جور، کذب و دروغ، مکر و فریب اور شر و فساد عام ہوتے جا رہے ہیں، ہر گھر بدکاری اور دشنام طرازی کا مرکز بنا ہے، اور صلحاء اور نیکوکاروں کا قحط ہے، جھوٹ علی الاعلان بولا جا رہا ہے، اور حق چپکے سے بھی کہنے والے معدوم ہیں، کاش لوگوں کے مزاج میں اعتدال و توازن پیدا ہو جاتا، اور یہ بے اعتدالیاں ختم ہو جاتیں، مگر افسوس برے لوگوں کو اس زمانہ میں معذور اور نیکوکاروں کی لعنت و ملامت کیجاتی ہے، اور قدیم زمانہ سے یہی دستور چلا آرہا ہے، کہ اہل باطل کی ان کے ظلم و تعدی کے باوجود حمایت و تائید اور اہل حق کا ساتھ نہیں دیا جاتا"

فلسفۂ عملی | یہ فلسفۂ ابوالعلاء کا خاص حصہ ہے، اس میں اس نے انسان کی فطرت و طبیعت اور دنیا وغیرہ کے متعلق اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کیے ہیں،

خیر و شر | اس کے نزدیک بھی انسان کی فطرت خیر پسند اور نیکی کیجانب مائل ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ "تم لوگ گمراہی کو اختیار اور اس چیز کو ترک کر دیتے ہو جس کی تعلیم تمہاری پاکیزہ اور خیر پسند فطرت دیتی ہے، انسانی طبیعت بلندیوں اور اولوالعزمی کے کاموں ہی کی طرف مائل ہوتی ہے، گو کہ شر کا حملہ بھی ہوتا رہتا ہے،

لیکن چونکہ دنیا میں شر کے محرکات اور اسباب زیادہ ہیں اور اس میں انسان کے ذوق و لذت

کی تسکین کا سامان ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں خیر اور راہ مستقیم اختیار کرنے میں شدائد و محن کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے عام طور پر لوگ شر کی جانب راغب اور شر پسند ہو جاتے ہیں، چنانچہ کہتا ہے کہ شر سے لوگوں کی ایسی رغبت ہو گئی ہے گویا وہ ان کی فطرت ثانیہ اور ان کا مزاج بن گیا ہے، وہ نیکی اور بھلائی کا کام تکلف سے اور برائی اور بدی کا کام طبعاً اور شوق و رغبت سے کرتے ہیں۔

عقل و فکر | چونکہ عام انسانوں کو انکی اصل فطرت سلیم کے خلاف گمراہی اور ضلالت ہی کے کاموں سے دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے ابو العلاء اس کا علاج یہ تجویز کرتا ہے کہ اس بارہ میں عقل و خرد کی رہنمائی اور فکر و نظر کی رہبری قبول کی جائے۔

"عقل و دانش انسانیت کا طغرائے امتیاز ہے، عقل سے بہتر کوئی راہبر او مشیر نہیں، وہ سفر و حضر ہر موقع پر راہنمائی کرتی ہے، اور اس کی راہنمائی نہایت قابل اطمینان اور باعث رحمت و برکت ہے، مال و دولت نہ ہو تو اس کا غم نہ کرنا چاہیے، عقل و دانش کی زیادتی مال و دولت کی فراوانی سے زیادہ بہتر ہے، اسی کی بدولت سود و زیان اور کفر و ایمان میں امتیاز ہوتا ہے، فکر و عقل مصلحت، دور اندیشی اور نیکی و تقوی کی تلقین اور شر و ضلالت سے باز رکھتی ہے، دنیا کے تمام عمدہ اختراعات اور بہترین ایجادات عقل و فکر ہی کے کارنامے ہیں، اس لیے عقل کو ہمیشہ راہبر اور چراغ راہ بنانے کی ضرورت ہے، زندگی میں حسن و موزونیت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔" جس چیز کو عقل باور نہ کرے، اسے کبھی صحیح نہ سمجھو، حدیثوں کی سندیں کمزور بھی ہوتی ہیں، اس لیے ہمیشہ عقل و درایت کی روشنی میں ان پر غور کرو، جب بھی لوگ تم سے کوئی بات بیان کریں تو اسے عقل و قیاس کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ لو۔"

وہ انسانی نفسیات کی عکاسی اور بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے سلسلہ میں لکھتا ہے،

"لوگ بلند بانگ اور بے دلیل دعوے کرتے ہیں، توبہ کرنے میں ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں

یہاں تک کہ موت کا وقت آجاتا ہے، اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، موت سے ڈرتے ہیں، حالانکہ وہ خوف و ہراس سے ٹل نہیں سکتی، دنیا پر نکتہ چینی اور اس کی عیب جوئی کرنے کے باوجود اس کی طلب و رغبت سے باز نہیں آتے جب رزق و نعمت ملتی ہے تو اتراتے ہیں اور ملک و دولت ہاتھ آتی ہے تو دنیا کو فسق و فجور اور شر و فساد سے معمور کر دیتے ہیں، اپنی غرض کے لیے تم سے قریب او ضرورت پوری ہو جانے کے بعد دور ہو جاتے ہیں، بڑے بڑے گناہ کرتے ہیں لیکن ان سے غافل رہتے ہیں، مٹی سے جس میں ہر انسان کو ملنا ہے، پرہیز کرتے ہیں، مصائب پر صبر طوعاً نہیں کیا کرتے ہیں، اور نیکی کا کام بے اختیاری میں کر جاتے ہیں، اور جب سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں تو کار خیر میں تامل ہوتا ہے، واعظ کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتے، لیکن لغو لاطائل باتیں نہایت توجہ سے سنتے ہیں، نصیحتوں کے باوجود ان کے دلوں کی سختی نہیں جاتی، خیر کو جو واضح اور صریح ہوتا ہے کوئی قبول نہیں کرتا اور شر کو گندہ و قبیح ہوتے ہوئے بھی اختیار کر لیتے ہیں، غلط کاموں پر تمہارا مذاق اڑاتے اور سچ کہنے پر خفا ہوتے اور پتھر مارتے ہیں، صرف ظاہر پر نظر رکھتے اور باطن سے آنکھیں بند کیے رہتے ہیں، چنانچہ ظاہری غلاظت اور گندگی دیکھتے ہیں تو دامن بچاتے ہیں، لیکن کھوٹ اور کینہ سے ان کا دل ہر وقت معمور رہتا ہے،

انسانی زندگی کے غائر مطالعہ اور بشری کمزوریوں سے واقفیت نے اس کو انسانی اجتماع سے کنارہ کش بنا دیا تھا، اور وہ زندگی کو عذاب، موت کو راحت اور دنیا کے عیش و تنعم کو بالکل ہیچ سمجھتا تھا، دنیا کی مذمت اور اس کی ناپائیداری کے ذکر سے اس کی شاعری بھری ہوئی ہے، موت کے متعلق کہتا ہے: "دنیا کی ہر چیز میں اختلاف ہے، لیکن موت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، ہر خطۂ زمین میں اس کے نقیب پھیلے ہوئے ہیں، سفر و حضر، محل اور جھونپڑی ہر جگہ اور سب کو آسکتی ہے، امیر غریب، ظالم و مظلوم، میدان رزم کے نبرد آزما اور بزدل و پست ہمت، یہاں تک کہ وہ طبیب حاذق بھی جو لوگوں کو۔۔۔ اس بتاتا اور پرہیز کراتا ہے، لقمۂ اجل بنجاتا ہے، موت کے وقت دوا، علاج، جھاڑ پھونک

اور مرنے کے بعد رونا دھونا اور جزع و فزع کرنا بالکل بے سود اور بیکار ہے۔

اس کے نزدیک موت کے بجائے زندگی، طول حیات اور بڑھاپا وغیرہ گھبرانے کی چیزیں ہیں، موت تو دنیاوی مصیبتوں سے نجات اور راحت کا سامان اور دنیا کے ہر غم و رنج سے چھٹکارا دینے کے لیے آتی ہے،

اس سلسلہ میں اس نے عورتوں سے عام نفرت، شادی کی مخالفت (زیادہ سے زیادہ ایک شادی کی اجازت) اور سوکنیں رکھنے پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اسی طرح اولاد کے متعلق ایسے ہی سخت خیالات رکھتا اور افزائش نسل کی مذمت اور اپنے لاولد ہونے پر فخر کرتا ہے،

ابو العلاء کی اس دنیا بیزاری، عزلت اور تجرد پسندی میں ایک حد تک ہندوستانی رہبانیت کا اثر نظر آتا ہے، آیندہ اس کی مزید وضاحت ہوگی،

گوشت خوری سے پرہیز ابو العلاء گوشت مطلق نہ کھاتا تھا، بعض مورخین کے نزدیک زہد و تدین، بعض کے نزدیک جذبۂ رحم و شفقت اور کچھ لوگوں کے خیال میں بدعقیدگی کی بنا پر گوشت کھانا چھوڑ رکھا تھا، لیکن اس کا سب کا اتفاق ہے کہ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا، اور اس نے گوشت خوری کی بڑی مذمت کی ہے، وہ انڈا تک نہیں کھاتا تھا،

ابو العلاء کے سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوا اور دوا کے لیے مرغ تجویز کیا گیا تو بمشکل کھانے کے لیے راضی ہوا، لیکن جب پکا ہوا مرغ اس کے سامنے لایا گیا اور اس نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، تم کو کمزور و ناتواں سمجھ کر لوگوں نے میرے علاج کے لیے تجویز کیا ہے، آخر شیر کے بچہ کو کیوں نہیں تجویز کیا گیا، اور اس کے کھانے سے انکار کر دیا،[1]

---

[1] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۰

ڈاکٹر اقبال نے اس واقعہ سے کیسا دلچسپ اور سبق آموز نتیجہ نکالا ہے:

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری — پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا — شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا — کہنے لگا وہ صاحبِ غفران لزومات
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو — تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو — دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات"[1]

"حیوان حساس ہوتے اور درد و الم کا شعور رکھتے ہیں۔ دینداروں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ گوشت نہیں کھاتے تھے، اس لیے کہ حیوانوں کو تکلیف دیے بغیر گوشت کھانا ممکن نہیں، بھیڑ بکریوں کا معاملہ بھی نوع انسانی کی طرح ہے، یعنی وہ بھی حاملہ ہوتی اور بچہ دیتی ہیں، اس لیے اگر بچہ ذبح کر کے کھایا جاتا یا انکا تمام دودھ دوہ لیا جاتا ہے تو وہ سخت نوحہ و زاری کرتی ہیں، اگر ان کے لیے ممکن ہوتا تو وہ بغاوت پر کمربستہ ہو جاتیں، کلام عرب میں بھی دشتیوں اور اونٹنیوں کے درد و غم اور بچوں کے تلف ہونے پر کرب و اذیت محسوس کرنے کا ذکر ملتا ہے، ایک حماسی شاعر کہتا ہے:۔

فما وجدت کوجدی ام سقب — اضلته فرجعت الحنینا[2]

سفاکی اور خوں ریزی کی مذمت اہنسا اور عدم تشدد کے ماننے والوں کی طرح وہ کسی پر تلوار اٹھانے اور خونریزی کرنے کا شدید مخالف تھا، چنانچہ کہتا ہے:۔

"اگر تم کو رشد و ہدایت کی توفیق ملی ہے تو تلوار کو خون سے رنگین نہ کرو، اور نہ کسی کو زخم پہنچاؤ، خونریزی کے لیے تلوار نہ نکالو، تلواروں کو میانوں ہی میں آرام ملتا ہے، سب سے برا کام یہ ہے کہ نوجوان

---

[1] بال جبریل ص ۲۰۹ و ۲۱۰ [2] رسالۃ الملائکہ ص ۹۰

بھوک کی تکلیف سے پریشان ہوکر خونریزی کرے، کسی کا ہاتھ پیر نہ کاٹو اور نہ خون بہانے کے لیے چھری چلاؤ، جس آدمی کا نیزہ ہر وقت رنگین رہتا ہو اس کو دیندار نہیں کہا جاسکتا، لوگو! جنگ کے شعلے نہ بھڑکاؤ۔

ایذا رسانی کی مذمت تمھاری لٹھیا ہی تمھارے بھائی کے سر کو زخمی کرتی ہے، (اس لیے اس کو چھوڑ دو) مجھے ہلاک ہوجانا پسند ہے لیکن تم لوگوں کو نقصان پہنچانا کسی طرح پسند نہیں،

ذبیحہ سے پرہیز "شر اور مصیبت نہ دینے والے لوگ نہ مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں اور نہ جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، لوگو! اونٹ اور بھیڑوں کو ذبح کرنے کا ناگوار کام کیوں بلاوجہ کرتے ہو، جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے چھری نہ تیز کرو اور نہ کسی ساتھی پر تلوار اٹھاؤ!

کھڑاؤں کا استعمال گوشت اور ذبیحہ سے اس قدر نفرت تھی کہ جانوروں کی کھال کا جوتا بھی نہیں استعمال کرتا تھا، اور اہل ہند کی طرح لکڑی کی کھڑاؤں پہنتا تھا۔

"میرے لیے لکڑی کا جوتا بناؤ، کھال پر مجھکو رحم آتا ہے"۔

جانوروں اور چڑیوں سے ہمدردی چڑیاں صبح کو دانہ چگنے جائیں تو ان کو خوفزدہ نہ کرو اور نہ ان کے انڈوں اور بچوں کو نقصان پہنچاؤ، اسی طرح جانوروں کو مارنا اور بھگانا برا ہے، چڑیوں کو تکلیف نہ دو اور نہ ان کے انڈے توڑو! ظلم بہت بری چیز ہے۔ شہد نہ نکالو! اس کی مکھی اسے بڑی محنت سے اپنے لیے تیار کرتی ہے، کتنی چڑیوں کے بلا گناہ پر کاٹ لیے جاتے ہیں، اور وہ پنجڑوں میں بند کردی جاتی ہیں، خدارا انھیں پینے کے لیے ایک چلو پانی دو اور انسانوں سے زیادہ قابل رحم سمجھو! اونٹنی اور گھوڑوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، وہ تمھارے کام آتے ہیں، لونڈی کو مارنے کے لیے لاٹھی نہ اٹھاؤ اور غلاموں کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آؤ، بھیڑیے کو بھیڑوں کو ہلاک کرنے کا موقع نہ دو، بھیڑوں اور بکریوں کا سب دودھ دوہ لینا اور ان کے بچوں کے لیے نہ چھوڑنا

اور انھیں مشقت دینا میرے خدا کو سخت ناپسند ہے،

جانور تو جانور ہیں ابو العلاء درختوں کو بھی ضرر پہنچانا گوارا نہیں کرتا تھا، غلاموں، کمزوروں، بوڑھوں، بچوں، اندھوں، بیواؤں اور دوسرے مصیبت زدہ لوگوں سے بھی وہ اظہار ہمدردی اور ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ سب کچھ اس کے جذبۂ رحم و شفقت اور عدم تشدد پسندی کا ثبوت ہے،

ان چیزوں کے علاوہ وہ ہندوؤں کی تہذیب و معاشرت کی بعض خاص چیزوں کا بھی ذکر کرتا ہے، مثلاً

مردے جلانا ہندوستان کے لوگوں کا مردے جلانا تم کو تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہ بہتر اور آرام دہ طریقہ ہے، اس لیے کہ اس طرح نہ لکڑ بگھے کا ڈر رہتا ہے اور نہ کفن چور کا خطرہ، ہمارے مردوں کو دیجانے والی کافور سے بہتر آگ ہے، اس سے تمام بدبو اور گندگی ختم ہوجاتی ہے، ہندوستان کے لوگ ایک صبح و شام کے گذرنے سے پہلے ہی مردہ کو جلاکر قبر کی تنگی سے بچا لیتے ہیں، وہ دینداری کی بنا پر مردے جلاتے ہیں۔

ہندوستانی اپنے جسم و جان کو خوف کی بنا پر آگ میں جھونک دیتے ہیں، جب وہ آگ میں اپنے کو جلاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ زمین کے لیے ان کا گوشت اور ہڈی باقی نہیں رہا، اور منکر نکیر کے سوال اور قبر کی تنگی سے بھی وہ بچ گئے، جو شخص آگ میں جلتا ہے اس کے اردگرد کے لوگ تلقین کرتے ہیں کہ یہ آگ نہیں لوبان ہے، رسالہ غفران میں لکھتا ہے کہ ایک ہندوستانی بادشاہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نوجوان اور نہایت خوبصورت تھا لیکن چیچک نکلنے سے بدصورت ہوگیا تھا، اس لیے اس نے اپنے کو آگ میں جلا دیا، اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اگلے جنم میں مجھے اس سے بہتر صورت عطا کرے۔

ستی کے موقع پر بہت سے لوگ جمع ہو کر یہ واقعہ دیکھتے ہیں اور مردہ کو صیبتیں کرتے ہیں، مشاہدین
کا بیان ہے کہ جلنے والا اگر آگ کی لپٹ سے نکلنا چاہتا ہے تو حاضرین لاٹھی اور لکڑی سے اسے اس میں
ڈھکیل دیتے ہیں۔"

تناسخ | تناسخ کے عقیدہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے، اگر تناسخ کا عقیدہ صحیح مانا جائے تو تم کبھی موسیٰ
اور تمھارے باپ حضرت اسحاق رہے ہونگے، ایک گروہ تناسخ کا قائل اور اس کو اس میں اتنا غلو ہے
کہ وہ فسخ (آدمی کے جسم کا حشرات الارض کی شکل میں منتقل ہوجانا) اور رسخ (جسم انسانی کا نباتات
وجمادات کی صورت میں تبدیل ہوجانا) کو بھی درست خیال کرتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ روح جسم
کو دوسری شکل وصورت میں منتقل کر دیتی ہے، حالانکہ یہ سب گمراہی اور بے دلیل باتیں ہیں، تم
کبھی ان کو نہ مانو!"

رسالہ غفران میں لکھتا ہے: "مذہب حلول ہی مذہب تناسخ کا باعث بنتا ہے، جو ایک پرانا
مذہب ہے، اور اہل ہند اس کو مانتے ہیں، شیعوں کی ایک جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے"

حکمت کی باتیں | اس کی کتابوں میں حکیمانہ باتوں کا بڑا ذخیرہ ہے، ان میں سے کچھ اوپر نقل کیجاچکی
ہیں، کچھ حکیمانہ مقولے یہاں نقل کیے جاتے ہیں،

"ارباب فضل وکمال کو اپنے وطن میں بھی غریب واجنبی سمجھا جاتا ہے، اور ان کے اعزہ ان سے
دور بھاگتے ہیں"

معمولی لوگوں کی عزت کیجاتی ہے، لیکن اہل فضل وکمال ہمیشہ نقصان اور گھاٹے میں رہتے ہیں،

بات چیت سے اپنا غم غلط اور مصیبت دور کرو، لوگوں کی باتوں سے مصیبتیں بھول جاتی ہیں،

تجربہ کے بعد بھی سچے کو جھوٹا اور جھوٹے کو سچا سمجھنا دائمی مصیبت کا باعث ہے۔

اگر قبر میں آدمی کو آرام ملے تو وہ تکلیف دہ محل سے بہتر ہے۔

عمل، اور جہلا کو قریب سے دیکھو تو زیادہ تر یکساں نظر آئیں گے۔

انسان عنفوان شباب میں گمنام مگر سن رشد کو پہنچنے کے بعد جب ہوشیار ہوتا ہے تو وہ مشہور
اور سردار بنتا ہے۔

ہوشیار اور محتاط آدمی کی رائے بھی کبھی کبھی غلط ہوجاتی ہے، جس طرح عبید سے وزن شعر
میں غلطیاں ہوگئی ہیں،

اس دنیا میں کوئی ذی حیات بلا دشمن نہیں،

فاسد طبیعت اور بدمزاج لوگوں کی اصلاح کی فکر کرنے سے بڑھکر کوئی مصیبت نہیں،

انسان آلام ومصائب کے بغیر عزت وسربلندی نہیں حاصل کر سکتا،

کثرت تعداد باعث شرف وعزت نہیں، جس طرح چٹیل میدانوں کی بیشمار کنکریاں ہاد اور
ہول کے برابر نہیں ہوتیں،

عادتوں کی طرح باتیں بھی بری اور زمانہ کی طرح لوگ بھی روشن اور تاریک ہوتے ہیں،

دن گذرنے کے بعد اسے پانا ناممکن ہے، چاہے فوج ہی لیکر اس کا تعاقب کیوں نہ کیا جائے،

آئندہ کل گذرا ہوا کل ہوجائے گا، اس میں کسی کو اختلاف اور شک نہیں، لیکن گذشتہ کل
کبھی آئندہ نہیں ہوسکتا، گذر جانے والے دن کو آہستہ یا تیز دوڑ کر بھی کوئی نہیں پاسکتا،

اپنے بھائی سے بھی اپنی بات مخفی رکھو، تمھارے دل کے بھید ہاتھوں کی لکیروں کی طرح
ظاہر نہ ہونے پائیں،

ناموں کی مشابہت سے افعال واعمال میں یکسانیت اور مشابہت نہیں ہوتی،

موت سن وسال کی بنا پر نہیں آتی کتنی لمبی عمر والے اونٹ باقی رہتے ہیں اور کم عمر والے مرجاتے ہیں،

درخت پھلتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے، جھکی ہوئی شاخیں تمھارے لیے دلکش اور

نظرافروز نہیں،

دشمن کی طرح دوست سے بھی چوکنے اور خائف رہو اور غیر مشتبہ کو بھی مشکوک سمجھو، مصیبت تو عموماً قریب تر آدمی ہی کی طرف سے آتی ہے۔

بات چیت کی طرح آدمیوں کی کثرت سے بھی شر و فساد برپا ہوتا ہے۔

چھوٹی باتوں اور معمولی چیزوں سے کبھی اتنے بڑے اور سنگین نتائج پیدا ہوتے ہیں کہ انکا علاج آسان نہیں ہوتا،

اپنی عزت کے معاملہ میں عیب جو اور کینہ سے ڈرو، اور کمینہ کو اپنے پر قیاس نہ کرو شیشہ ٹوٹنے کے بعد جوڑا جا سکتا ہے، لیکن کتنے موتی ٹوٹ جاتے ہیں اور انھیں جوڑا نہیں جا سکتا،

مال کو زینت و جمال سمجھنا آدمی کی بے عقلی کی دلیل ہے۔

انسانی فطرت ٹیلوں کے مانند ہوتی ہے، جو لوگ اسے ہٹانا اور ہلانا چاہتے ہیں وہ ناکام رہتے ہیں،

ہمارے الفاظ و اقوال اسی وقت موثر ہو سکتے ہیں جب ہمارے اعمال بھی اسکی تصدیق کریں،

زمین پر کیسی اچھی اچھی شکل و صورت کے لوگ ہیں لیکن ان کے کام اچھے نہیں ہوتے،

کتنے نابالغ بچے بڑے بوڑھوں کو راہ حق پر گامزن کر دیتے ہیں،

مصائب و تعب جھیلے بغیر ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، جس طرح پانی کے اوپر تیرنے والا موتی نہیں پاتا،

مال و دولت کی فراوانی نوجوانوں کو بدبخت اور مغرور کر دیتی ہے، اور لمبے دامن والے کو ٹھوکر لگتی ہے۔

آگ دور سے کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے چھونے سے انگلیاں جل جاتی ہیں۔[1]

---

[1] لزومیات

اگر چہ عمدہ نہ ہو تو شاخیں کیا بہتر ہوں گی،

طالب دنیا کے لیے ندامت اور شرمندگی ضروری ہے،[1]

چراغ لیکر سورج کا مقابلہ کرنا حماقت ہے،

اپنی قدر و قیمت جاننے اور سمجھنے والا آدمی کبھی ہلاک نہیں ہو سکتا،

ایک ملامت کا ہدف بننا بہت سی ملامتوں کے ہدف بننے سے زیادہ آسان ہے،

اکثر گفتگو کے نتیجہ ہی میں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

رائد (تلاش منزل کو جانے والا) اپنی قوم سے غلط بات نہیں کہتا، غلام اگر اپنے آقا سے جھوٹ کہتا ہے تو وہ یقیناً بدبخت ثابت ہوگا، گذشتہ کل کو یاد نہ رکھنے والا غافل اور اپنی حیثیت کو نہ سمجھنے والا جاہل ہے،

مال تو عاریت ہے، اس کے ضائع ہونے میں عار کی بات نہیں، امیدوں کا حال بادلوں کی طرح ہے، اور کچھ بادل آکر چلے جاتے ہیں اور کچھ برستے ہیں، آدمی کی مذمت اس کی بدعملی کی بنا پر کیجاتی ہے، نہ کہ امیدوں کے فوت ہونے پر، ہم کو خداوند قدیر ہی سے ضائع ہونے والی چیز کی تلافی کی توقع رکھنا چاہیے۔

مودت و محبت کی دو قسمیں ہیں، دافیہ اور عافیہ، اول اللہ کی جانب سے اور دوسری شیطان کی طرف سے ہوتی ہے،[2]

کیا ابوالعلاء ملحد اور زندیق تھا

سب سے پہلے اجمالاً نمبروار ہم ان اسباب و علل کو بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر اسے ملحد و زندیق کہا جاتا ہے،

(۱) اس نے معارضۂ قرآن میں ایک کتاب (الفصول والغایات ومحاذاۃ السور والآیات) لکھی،

---

[1] رسالۃ غفران [2] رسائل ابی العلاء،

(۲) اسلام کے دو اہم اور بنیادی عقیدوں رسالت وقیامت کا منکر تھا:

ولا یومن بالرسل والبعث والنشور[1]
وہ رسالت اور حشر ونشر کا قائل نہیں تھا'

(۳) دین کے متعلق اس کو شکوک وشبہات تھے، ابو زکریا کا بیان ہے:-

قال قال لی المعری ما الذی تعتقد
فقلت فی نفسی الیوم اقف علی
اعتقادہ فقلت لہ ما انا الا شاک[2]
فقال وھکذا شیخک[3]

مجھ سے معری نے میرا عقیدہ دریافت کیا
تو میں نے اپنے جی میں کہا آج مجھکو اس کا
عقیدہ معلوم ہو جائیگا، اس لیے میں نے
اس سے کہا کہ مجھکو تو شبہات ہیں، معری نے
کہا یہی حال تمھارے شیخ کا بھی ہے۔

(۴) ہندو مذہب کی طرف مائل تھا، اسی بنا پر وہ جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت
کھانا پسند نہ کرتا تھا:۔

ونسب الی التمذھب بمذھب
الھنود لترکہ اکل اللحم خمسا و
اربعین سنۃ وکذالک البیض
واللبن وکان یحرم ایلام الحیوان[1]

ہندو مذہب کی طرف اس کی نسبت اس لیے
کیجاتی ہے کہ اس نے ۴۵ سال تک گوشت
اور انڈے کھانا اور دودھ پینا ترک کر دیا تھا
وہ جانوروں کو تکلیف دینا بھی حرام سمجھتا تھا،

اسی وجہ سے وہ قتل وخونریزی کا بھی مخالف تھا، اس کی وفات کے بعد جو مرثیے کہے گئے
ان میں سے ایک مرثیہ کا شعر ہے:

ان کنت لم ترق الدماء زھادۃ
فلقد اراقت الیوم من جفنی دما

تونے (زندگی میں) زہد کی بنا پر کبھی خونریزی نہیں کی لیکن آج (مرنے کے بعد) میری آنکھوں سے
خون بہا رہا ہے۔

---

[1] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۰۰، [2] ایضاً ص ۱۰۱، [3] تاریخ ابوالفداء ج ۲ ص ۱۷۶

(۵) ازدواج اور افزائش نسل وغیرہ کو، صرف ناپسند بلکہ معصیت اور گناہ سمجھتا تھا:

وبلغنی انہ اوصی ان یکتب علی
قبرہ ھذا البیت:

اس نے اپنی قبر پر یہ شعر لکھنے کی
وصیت کی تھی:

ھذا جناہ ابی علی
وما جنیت علی احد

میرا وجود میرے باپ کی جنایت کا نتیجہ ہے
لیکن میں نے کسی بچہ کو وجود دینے کا جرم نہیں کیا،

وھو ایضاً متعلق باعتقاد الحکماء
فانھم یقولون ایجاد الولد واخراجہ
الی ھذا العالم جنایۃ علیہ انہ
یتعرض للحوادث والآفات

(ابن خلکان ج ۱ ص ۵۵)

اور یہ بات فلاسفہ کے عقیدہ کے مطابق ہے جو بچے
پیدا کرنے اور انکو اس دنیا میں جننے کو جنایت اور بچے
کے حق میں زیادتی تصور کرتے ہیں کیونکہ دنیا میں انکو
آلام ومصائب کا شکار بننا پڑتا ہے۔

اس کی حد سے بڑھی ہوئی دنیا بیزاری اور عزلت پسندی کو بھی جو اسلامی روح کے منافی
ہے، اسی میں شامل سمجھنا چاہئے۔

(۶) اس کی بدعقیدگی اور ضلالت کے ثبوت میں ایک خواب بھی بیان کیا جاتا ہے:

قال ابن الصابئ ولما مات
المعری رأی بعض الناس فی منامہ
کان افعیین علی عاتقی جبل ضریر
تدلیا الی صدرہ تم رفع رأسیھما
فھما ینھشان من لحمہ وھو یستغیث
فقال من ھذا فقیل المعری الملحد

ابن صابی کا بیان ہے کہ جب معری کا انتقال
ہوا تو کسی نے خواب دیکھا کہ دو سانپ جو
ایک نابینا کے کندھوں سے لیکر سینہ تک
لٹکے ہوئے ہیں، اس کا گوشت کھا رہے ہیں
اور وہ فریاد کر رہا ہے، اس نے کہا یہ کون ہے
کہا گیا کہ ملحد معری،

یہ وہ باتیں ہیں جن کی بنا پر اس کے دین وایمان پر شبہہ کیا جاتا ہے، لیکن اس میں غلط فہمیاں

زیادہ ہیں، اس لیے اس کی تحقیق ضروری ہے،

(۱) معارضہ قرآن میں اس کی جس کتاب کا ذکر کیا جاتا ہے اس کے متعلق اس کی تصنیفات کے سلسلہ میں تحقیق بتایا جاچکا ہے کہ اس کا نام صرف "الفصول والغایات" تھا۔ "فی محاذاۃ السور والآیات" کتاب کے نام کا جزء نہیں، بلکہ اضافہ ہے جو غالباً اس کے موضوع کی وجہ سے کر دیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے جب نام کے متعلق ایک فاحش غلطی کیجا سکتی ہے تو موضوع کے متعلق بھی غلطی کا ہوجانا کچھ بعید نہیں، لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب کا اصل نام وہی ہے تو بھی یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ابوالعلاء نے اس میں قرآن کی تحدی کا جواب یا اس کا معارضہ کیا تھا بلکہ محاذات دراصل عمل تنی علی، خدا ترسی کو کہتے ہیں، جس کو دوسرے لفظوں میں تضمین بھی کہا جاتا ہے، بعض اکابر سے بھی اس طرح کی کتابیں منسوب ہیں، مثلاً شریف رضی کی ایک کتاب کا نام کتاب "فی محاذاۃ الآثار النبویہ" ہے۔

معارضہ قرآن کو اس کی جانب منسوب کرنا اس لیے بھی درست نہیں کہ اس کے کئی شعروں میں قرآن مجید کی عظمت و برتری کا ذکر اور رسالۃ الغفران وغیرہ میں اکثر اس کی آیتوں سے استدلال و استشہاد کیا گیا ہے، اور ایک جگہ تو نہایت صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ "ملحدین و مهتدین سب کا اتفاق ہے کہ قرآن کے اعجاز و بلاغت کا کوئی اور کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی، اس کے کمال کے سامنے دشمن بھی عاجز ہیں، اس کا تتبع اور مقابلہ مشکل، اور اس کے عجیب و غریب امثال کی مثال نہیں، وہ نہ موزوں قصیدہ ہے اور نہ رجز، اور نہ عربوں کی خطابت اور کاہنوں کے سجع کی طرح کی کوئی چیز، وہ سورج کی طرح روشن اور تابناک ہے، اگر جبال اس کو سمجھ لیں تو شق اور چور چور ہو جائیں، اس کی ایک آیت یا آیت کا کوئی ٹکڑا بھی مخلوق کے عمدہ اور فصیح ترین کلام کے سامنے رکھا جائے تو ظلمت شب میں شہاب کی طرح جگمگا رہا ہوگا، یا چٹیل اور ویران زمینوں میں کوئی تر و تازہ اور شگفتہ کلی کھلی ہوئی معلوم ہوگی۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔" (رسالۃ الغفران ج ۱، ص ۱۴۳)

ان صریح خیالات کے ہوتے ہوئے کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نے قرآن کے مقابلہ یا معارضہ پر کتاب لکھی ہوگی، اس لیے اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے اس کے کفر و الحاد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن جوزی اور ان کے مقلد بعض مصنفین کے سوا کسی اور نے ابوالعلاء کی بے دینی اور الحاد کا سبب اس کتاب کو نہیں قرار دیا ہے علامہ دمیری نے اس کی جانب معارضۂ قرآن کو منسوب کرنے میں جو طرز بیان اختیار کیا ہے اس سے اس کا ضعف ظاہر ہے،

(۲) یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد خصوصاً رسالت اور معاد کا منکر تھا، اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے کہ وہ توحید، رسالت، قیامت، کتب الٰہی اور تقدیر سب کا قائل تھا، اور قیامت کے سلسلہ میں عذاب، ثواب، جزاء و سزاء، حشر و نشر کو مانتا تھا، بلکہ عذاب الٰہی کا اسے خوف رہا کرتا تھا، اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی کو ترجیح دیتا تھا، اسی طرح رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اسے گہرا تعلق تھا، ایسی صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ان چیزوں کا منکر تھا، زیادہ سے زیادہ جو الزام اس پر لگایا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کہیں کہیں پر ان کا استہزا کیا ہے، مگر اس کے مقابلہ میں اقرار زیادہ قوی ہے۔

(الف) عموماً انکار یا استخفاف کی باتیں اس نے دوسروں کی نسبت سے بیان کی ہیں، اور گو اس میں کہیں کہیں فحوائے کلام سے اس کی تائید اور رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے،

(ب) باطل اور غلط قسم کی دینداری جو ریا اور فریب پر مبنی ہو اسے قطعاً پسند نہ تھی، اس قسم کے لوگوں سے اس نے سخت نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا ہے، اور چونکہ ایسے لوگ دین اور مذہب ہی کو آڑ بناتے ہیں، اس لیے یہاں کی مخالفت میں حد اعتدال سے آگے بڑھ گیا، چنانچہ کہتا ہے کہ مذہب کھانے کمانے کا ایک ذریعہ ہے اور اسی کی بدولت نوع انسانی میں اختلاف تفریق اور بغض و عداوت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس ضمنی تنقید کو مذہب کے حقیقی انکار پر محمول نہیں کیا جا سکتا،

(س) یہ پہلو بھی قابل لحاظ ہو کہ ابوالعلاء شاعر و فلسفی اور ادیب تھا، اس لیے اس کی اس قسم کی باتوں کو

ثقہ و ذمہ دار اصحاب دین و تقوی کے معیار پر نہ جانچنا چاہیے، اور مجموعی حیثیت سے اس کے یہاں دین کے بنیادی عقائد کا جو اقرار و احترام موجود ہے، اس کو بے دینی سے برأت کے لیے کافی سمجھنا چاہیے، لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس کے بعض عقائد و تصورات دینی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہیں، مگر اس سے اس کے الحاد و زندقہ کا ثبوت مشکل ہے۔

(۴) ہنود و مذہب اور برہمینت سے متاثر ہونے کا الزام اس حد تک صحیح ہے کہ گوشت خوری وغیرہ کے متعلق اس کے خیالات ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں، لیکن یہ اس کا ذاتی فعل اور طبعی رجحان تھا، اس کو عقیدہ و مذہب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن جانوروں کو ذبح کرنے اور گوشت کھانے کو معصیت خیال کرنا ضرور قابل اعتراض بات ہے۔

(۵) ازدواج اور افزائش نسل وغیرہ کے متعلق بھی اس کے خیالات ذاتی تھے، لیکن انھیں معصیت اور گناہ سمجھنا قابل اعتراض ہے، تاہم اگر عقائد اور مذہب کی بنیادی باتوں میں خرابی نہ ہو تو نمبر ۴ و نمبر ۵ کی باتیں بھی کسی کو ملحد و زندیق ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں

(۶) باقی رہا خواب کا معاملہ تو اس سے کسی کے دین و ایمان کے ثبوت و نفی پر استدلال کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے جو کم از کم ہم جیسے اہل ظاہر لوگوں کی فہم و فکر سے بالاتر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین و ایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، اس میں عجلت، جلد بازی اور بے احتیاطی کی ضرورت نہیں، جن علماء نے معری کے کفر و الحاد کا فیصلہ کر دیا ہے، وہ اس لیے قابل ملامت نہیں کہ یہ ان کی دینی حمیت اور مذہب سے گہرا تعلق کا ثبوت اور مذہب کے معاملہ میں کسی غلط بات کو نہ ماننے اور انگیز نہ کرنے کا نتیجہ تھا، اور یہ صحیح ہے کہ معری کے بعض خیالات و عقائد یقیناً اسلامی نہیں تھے، تاہم جس حد تک بھی ممکن ہو تکفیر و تفسیق میں احتیاط ضروری ہے، اور کوشش اس کی ہونی چاہیے کہ کسی مسلمان کو دائرہ اسلام

سے خارج نہ کیا جائے، معری کا خود بھی یہی اصول ہے، وہ رسالۃ الغفران میں لکھتا ہے:

واللہ اعلم بحقیقۃ الامر	اللہ تعالیٰ صحیح صورت حال کو زیادہ
ولا احکم علیہ بانہ من اھل	بہتر جانتا ہے، اس لیے میں اس کے جہنمی
النار وانما ذکرت ما ذکرت فیھا	ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا، باقی جو کچھ
نقالم لالی عقدتہ بمشیئۃ	میں نے پہلے ذکر کیا ہے تو اس کو مشیت ایزدی
اللہ وان اللہ لحلیم وھاب	سے وابستہ کر کے اور اللہ تعالیٰ حلیم و وہاب ہے'

پھر جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، معری ایک شاعر و فلسفی تھا، اس لیے اس کی باتوں میں تضاد ممکن ہے، اور جب اس کے اکثر و بیشتر خیالات اسلامی ہیں تو اقل کے مقابلہ میں اکثر کے مطابق کوئی حکم لگانا بہتر ہے، اور اگر وہ واقعی بے دین تھا، تب بھی محتاط علماء کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ آخر میں وہ تائب ہو گیا تھا، اس لیے اس کو اس کی جملہ خرابیوں اور گمراہیوں کے باوجود بھی مسلمان ہی کہنا چاہیے۔

آثارِ علمیہ و ادبیہ

خطوط اکبر الٰہ آبادی مرحوم

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الٰہ آباد - ۱۵ فروری ۱۵ء

مجی و مکرمی، زاد لطفہ

نظم پہنچی، نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا ہے۔ اور دل پر اثر پڑتا ہے

مرکز امید جو تھا جب وہی جاتا رہا الخ — اب پر پرواز معنی کون بخشے گا مجھے الخ

کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن الخ — کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم الخ

کیا لاجواب شعر ہیں، معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے،

اللہ تعالیٰ آپ کو سکون خاطر عطا فرمائے۔ دیکھئے کر دنیا کیا ہے، ہمیشہ دل برداشتہ رہئے، میں خود غموں میں مبتلا ہوں۔ میرا یہ شعر ملاحظہ ہو،

سوا خدا کے کسی کا خیال آ نہ سکا — غموں نے کام دیا دل کی پاسبانی کا

وہ چمن ہی جل گیا جسمیں لگائے تھے شجر — اب تجھے پاکر میں اے یاد بہاری کیا کروں

جان ہی کا جسم میں رہنا ہے مجھکو ناگوار — دوستوں سے ادعائے دوستداری کیا کروں

کبھی ادھر سے گذریے اور سنیے کہ میں زندہ ہوں تو ملیے گا

ان روزوں بہت متردد ہوں، بداندیشوں اور بدگمانیوں کے سبب سے خاموشی مناسب سمجھی ہے،

اکبر

الٰہ آباد - ۱۰ فروری ۱۵ء

عزیزی و محبی سلمہ اللہ تعالیٰ

میں کس حالت میں ہوں، کس عالم میں ہوں، موجودہ حالات میں کیا نازک حالت ہے، کیا کہوں کبھی ملیے تو سنیے۔

آپ کے مضامین زمیندار میں دیکھے، دل بیچین ہوا، اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوا، میں کسی انجمن، سوسائٹی، کمیٹی وغیرہ کا کبھی ممبر ہوا ہی نہیں، مدتیں گذریں، خوب سوچ سمجھکر اور زمانے کا رنگ دیکھکر میں نے یہ کہا تھا

ادبار کے ہیں یہ دن اولوالعزم نہو — ہونی ہے شکست مائلِ رزم نہو

رونق محفل کی اب نہیں ہے تجھسے — گوشے ہی میں بیٹھ عازم بزم نہو

بلاشبہہ دنیا بغیر شغل کے چل نہیں سکتی لیکن مجھکو کچھ زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی کبھی کبھی بہت دقتیں اٹھائیں، لیکن اسی خیال پر مستقل رہا، خدا کرے نبھ جائے۔

لیکن آپ کی تحریک کو نامنظور نہیں کر سکتا، کیوں؟ بات یہ ہے کہ خود ہمارے پیارے دوست اور قدر افزا۔ مکرم مرحوم[1] نے یہ تحریک مجھ سے کی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیا کر سکوں گا، لیکن بہرحال میرا نام لکھ لیجئے، آپ کی کامیابی کی دعا

---

[1] مولانا شبلی مراد ہیں۔

کرتا ہوں، اور آپ کی محبت اور وفاداری جو مرحوم کے ساتھ ہے، اس وجہ سے آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں، کبھی کبھی خط لکھا کیجئے

اکبر

پریاواں ضلع پرتاب گڈھ

۴ر مارچ ۱۵ء

قدرافزاے اکبر سلمہ اللہ تعالیٰ

ارادہ تھا کہ یہاں سے لکھنؤ جاؤں اور وہاں سے اور کہیں، لیکن حالات ایسے پیش آئے کہ نہ دل کو اطمینان نہ حواس کو اجتماع، صحت بھی اچھی نہیں، انشاء اللہ کل الہ آباد واپس جاؤنگا، اور بہر حال ہفتے عشرے وہاں قیام رہے گا، آپ نے لکھا تھا کہ ۱۰ر مارچ سے تعطیل ہے، اگر موقع ملے تو الہ آباد میں مجھ سے ملیے، اطلاعاً عرض ہے، ملاقات ہوئی تو سنیے گا دیکھیے گا کہ کیا حالات ہیں۔

دعاگو
اکبر حسین

پریاواں ضلع پرتاب گڈھ

۳۰ر جولائی ۱۶ء

حبیب مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

حضرت ماجد کی شادی کی آپ نے لاجواب تاریخیں فرمائیں، داد دیتا ہوں، اگرچہ آپ اس سے مستغنی ہیں،

مجھکو اب تک صدمہ ہے کہ آپ الہ آباد تشریف لائے، مجھ سے ملنے کا قصد کیا، لیکن کمبخت ملازم کی نادانی سے میں مسرت ملاقات سے محروم رہا، میں اچھا نہ تھا، گھر میں تھا بستر پر تھا،

لیکن وہ کیا جانتا تھا کہ آپ کے ملنے کا انبساط مرض کو آدھا کر دیگا، میں نے اسی دن بیسیوں آدمی دوڑائے، بیسیوں خط لکھے، کچھ پتہ نہ لگا، ماجد میاں نے بھی لکھا کہ مجھکو ان کا ایڈرس معلوم نہیں، پونا و بمبئی وغیرہ سے بھی یہی جواب آیا، مجھکو یاد آتا ہے کہ میں نے اعظم گڈھ کے پتے سے بھی آپ کو نیاز نامہ لکھا، یا تو وہ پہنچا نہیں یا آپ کو جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی، یا دل نہ چاہا، اگر ایسا ہوا تو حق بجانب تھا، میں اپنا حال کیا لکھوں، ایک مقطع حسب حال کہا تھا،

اپنے غمخانے کا دروازہ کرو بند اکبر   اب نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

بعض پرائیویٹ وجوہ سے قیام الہ آباد سے دل برداشتہ ہوں، شاید کہیں اور جا رہوں، دنیا سے تعلق کیا رکھوں، کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لیے، دل کہتا ہے، اور سچ کہتا ہے، کے دن کیلئے اور کس کے لیے، خدا آپ کے کاموں میں برکت دے، قوم فیضیاب ہو،

بر شما خوش باد ایں غمخانہ نا ماندنی

پتہ الہ آباد کا کافی ہے،

خاکسار
اکبر

امین آباد لکھنؤ ۲۴

۱۴ر اگست ۱۶ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ

گستاخی کی آپنے خوب کہی، میری نہایت عزت افزائی آپنے فرمائی ہے، پھر آپکے سوا ہمارا ہے کون رہا کون، ہاں حضور اعتراض کی دھمکی بھی دیگئی ہے، حیات ہی میں ریویو نگار سارا قصہ ختم کیا چاہتے ہیں، نہ مرید کرنا تھا نہ صلہ لینا تھا، بار دل اتار دیا، اب تو دل ہی نہیں لگتا،

اوّلت نا شدہ ختم است و من آخر شدہ ام

آپ میں شاعرانہ جوہر اس سے زیادہ معلوم ہوتا ہے جس کی جھلک آپکے چند اشعار میں دیکھی۔ یہ زمانہ ہماری شاعری کے لیے مساعد نہیں ہے۔ کبھی ملنا ہوا تو آپسے گفتگو ہوگی۔ میں نے یہاں سن لیا تھا کہ ہمارے دوست ماجد صاحب علی گڈھ میں خوش نہیں رہے۔ سب پر ناخوشی طاری ہے۔ فلسفہ کیوں پڑے۔

کارڈ سامنے تھا لکھ دیا۔ معاف فرمائیے گا۔ ابھی میں یہاں بشرط زیست ۱۰ - ۱۵ دن رہونگا۔ دہلی کا بھی قصد ہے۔ انشاء اللہ۔ اچھا نہیں ہوں۔ حواس بجا ہوں تو خدمت میں کیا عذر۔ آپ کا شعر بھول گیا لکھیے تو یاد آئے کہ میں نے کچھ کہا تھا اور کیا کہا تھا۔

خاکسار

اکبر

امین آباد پارک نمبر ۲۴

۵/اکتوبر ۱۹ سنہ

مکرمی : السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت سے ارادہ تھا کہ داد سخن کیا شکر گذاری کروں، آج ساعت تھی کہ قلم اٹھا۔ کیا کہوں کن پریشانیوں میں رہا اور ہوں،

میرے خرافات نے مجلس علماء و فقہا سے داد پائی۔ اس کو اپنے خرافات کا ارتقا سمجھتا ہوں، دیکھئے آپ سے کبھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر دسمبر تک یہاں رہا تو شاید ایسا ہو۔

خاکسار

اکبر

پرتاب گڈھ - ۱۵/اکتوبر سنہ

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالی

شب گذشتہ کو آپ کا کارڈ لکھنؤ میں مجھکو ایسے وقت میں ملا کہ میں دو مہینے کے قیام کے بعد یہاں آرہا تھا، گویا گمشدہ[1] بہ دست تھا، کیا کہوں کیسی حسرت و پریشانی ہوئی، اگر تمام خطوط نہ بھیج چکا ہوتا اور کل انتظام بدل نہ گیا ہوتا تو ٹھہر جاتا۔ میں بھی بیحد غیر معمولی تردداٹ میں ہوں ماجد صاحب اس وقت تشریف فرما تھے، میں نے پیام شوق و مسرت ان کے سپرد کیا، ہرکیف آپ لکھنؤ آئیں تو مجھکو مطلع فرمائیں۔ جائے قیام اور مدت قیام، خط الہ آباد کے پتے سے آئے۔ جہاں ہوں گا انشاء اللہ بشرط زندگی مل جائے گا، ممکن ہے کہ لکھنؤ آنے کی کوشش کروں، خدا سے دعا ہے کہ آپ کے گھر میں صحت حاصل ہو اور آپ تردد سے نجات پائیں۔

آپ کا ترقی خواہ

اکبر حسین

پرتاب گڈھ بنگلہ سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

۱۲/فروری ۱۹۱۷ سنہ

مکرمی سلمہ اللہ تعالی

جنوری کا مہینہ بیماری میں گذرا، ابتک طبیعت بحال نہیں ہوئی، نہایت افسوس ہے کہ آپ سے لکھنؤ میں نہ مل سکا، آپ کی خیریت ہمیشہ دریافت کرتا رہا، آپ کے طرز سخن سے جو آگاہ نہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے میرے ناچیز کلام کی نسبت جو بعض ریمارک کسی تحریر سابق میں کیے وہ میرے لیے باعث فخر ہیں۔ میں نے اس کا اعتراف نہ کیا، ممکن ہے کہ کچھ غلط فہمی ہوئی ہو۔

---

[1] بجائے پا برکاب کے یہ الفاظ میں نے اختیار کیے۔ اکبر

خیر مجھکو جانے دیجئے، کہ

حیف است ذکر من آنجا کہ دوست است

آپ سے مجھکو کیوں نہ دلی تعلق ہو، اولاً آپ میرے قدر افزا دوست، مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد ہیں،
دوسرے خود ایسے قابل اور سنجیدہ ہیں کہ آپ سے قطع نظر مشکل ہے، خواجہ حسن نظامی صاحب کے محرم نامے
کے متعلق آپ کی تحریریں دیکھیں، اظہار مدعا میں جو لطافت و نزاکت ہے آپ ہی کا حصہ ہے،
خواجہ صاحب صوفی نہاد بزرگ ہیں، ان کے کاموں میں کچھ روک ٹوک نہیں، دنیا کا تعلق ضرور تھا،
مذہبی ہسٹری پر جھک پڑے۔

معلوم نہیں ندوے سے آپ کو تعلق ہے یا نہیں، سید عقیل میرا پوتا ہے، دس برس کی عمر ہے،
میں عشرت سے کہتا ہوں کہ اس کو عربی پڑھاؤ، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ندوے میں داخل ہو
اور اس کی نگرانی کے لیے ایک مولوی صاحب ساتھ رہیں، کوئی عزیز بھی رہے، کچھ
انگریزی تعلیم بھی ہوتی رہے، کیوں ایسا خیال ہے کہ وہ گھر پر نہ رہے، کبھی ملنا ہوا تو عرض کرونگا،
میرا یہ حال ہے کہ زندگانی بار ہے، وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا، اب فکرِ
آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا

میچکد خون دل از حسرتِ دیرینۂ ما
می طپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

اپنی خیر و عافیت لکھئے۔ ع
بر شما خوش باد ایں غمخانۂ ناماندنی

آج صبح میں پرتاب گڈھ آیا ہوں، ابھی یہاں قیام رہے گا،

اکبر حسین

پرتاب گڈھ - ۶ر اپریل ۱۷ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

خدا جانے خواجہ صاحب کی غلطی تھی یا پالیسی یا عقائد میں تبدیلی، بہرکیف خواجہ صاحب
میرے بڑے عنایت فرما ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ترددات سے نجات دے، میں خود ایسی کشمکش
میں ہوں کہ زندگی دشوار ہے،
میں آپ کی مدح میں مبالغہ نہ کرونگا کہ آپ کو تصنیف شعر کی زحمت ہو (آپکا شعر خوب ہے)
یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں، اسی سبب سے آپ کا مشتاق رہتا ہوں کہ کچھ سیکھوں۔

زخود بہترے جوئی و فرصت شمار کہ باخوہان خودی گم کنی روزگار

میرے ایک دوست نے میرا حال دریافت کیا تھا، میں نے یہ شعر لکھا

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا یہی حال کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مرگیا

انھوں نے بیحد پسند کیا، شاید نقاد میں چھپا ہیں،
اشد ضرورت سے میں ایک ہفتے کے لیے لکھنؤ گیا تھا، سخت افسوس ہوا کہ ماجد صاحب
نہ ملے، باندے گئے تھے، اپنی خیریت لکھتے رہئے، کبھی کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجئے، آپ کو نظم سخن میں سلیقہ خاص
ہے، کبھی ملے گا تو تفصیلاً سنئیے گا، ہمدم میں میرے چند شعر چھپے ہیں، صواب کی جگہ ثواب کر دیا ہے،

دعا گوئے شما
اکبر

الہ آباد - ۱۲ر مئی ۱۷ء

ڈیر فرینڈ

آپ کے اشعار نے میرے داغ دل ہرے کر دیے، ہرے تو رہتے ہی ہیں، یہ کہیے
لہولہان کر دیے - جوش غم نے آپ سے ایسے مصرعے کہلا دیے

شمع اس راہ میں اسکا نخ انور ہو! وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوت قافیہ پیمائی کافی نہیں، میں نے بھی کیا کچھ نہیں کہا تھا، آپ نے دیکھا ہو گا یا کبھی سنیے گا۔

نشاط طبع باقی نہیں، ناتوانی روز افزوں کچھ ہو نہیں سکتا، فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کن اشعار کو منتخب کروں، بہر حال تعمیل ارشاد کی کوشش کروں گا،

کاش آپ سے ملاقات ہوتی۔ آپ کا دعاگو

اکبر

الہ آباد - ۲۱ مئی ۱۷ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی غزل کے ایک شعر نے مجھکو اپنے دو شعر یاد دلائے، جن کو فریاد مجنونانہ اور جذبات غم کی انتہا کے ذیل میں میں نے لکھ لیا تھا،

جس سے میری زندگی تھی مر گیا کیوں مر سکا ۔ یہ چرخ نے مجھ پر ستم یا رب کیا کیوں کر سکا

واقعات جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع ۔ کیوں نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈر سکا

افسوس ہے کہ مجھکو آپ سے ملنا یاد نہیں رہا، صرف آپ کا نام جانتا ہوں، شاید آپ بھی مجھ کو اچھی طرح نہ جانتے ہوں، بجز اس کے کہ چند ظریفانہ اشعار سن لیے ہیں، کاش آپ سے ملاقات ہو، اسکے بعد بے تکلفانہ مراسلت ہو سکتی ہے۔ آپ تو شاعر بھی ہیں فلاسفر بھی، مورخ بھی۔ شاید فقیہ بھی، اور اس علم اور اتنے بڑے کتب خانے کے ساتھ۔ اور کیا کیا نہیں، آپ کیوں مجھ سے ملاقات کے مشتاق ہوں گے۔

نظام کے فلسفے کی تمہید آپ نے خوب لکھی ہے۔ اس کا ایک فقرہ اپنے الفاظ و معنی کے

لحاظ سے نہایت دلکش ہے، اور مجھکو میرا مطلع یاد دلاتا ہے،

یوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی ۔ لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

مجھ کو ایسے مسائل پر تعجب ہوتا ہے کہ خدا اپنی نظیر اور اپنا مثل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ سائل وہ شخص ہے جو خدا کو غیر مخلوق مانتا ہے،

ممکن ہے یہ بھی پوچھا جائے، اللہ میاں خودکشی کر سکتے ہیں یا نہیں،

کبھی لکھنؤ کا قصد کیجیے تو مجھ کو مطلع کیجیے، زندہ رہا ممکن ہوا تو حاضر ہوں گا، دار المصنفین سے کوئی انگریزی پرچہ نکلے تو خوب ہے،

آپ کی پارٹی کے اپر کلاس کے انگریزی داں نوجوان مذہب و ملت سے بہت بے پروا ہوتے جاتے ہیں، حریف باخبر سے مقابلہ کرنے کی ان میں مطلق طاقت نہیں، یہ امر خطرناک ہے۔ تسکین اس خیال سے ہوتی ہے کہ حریف بھی بیخبر ہو جائے گا،

انشاء اللہ جواب آنے پر کچھ اشعار عرض کروں گا، اس قدر مختلف پہلو ہیں کہ انتخاب میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے،

میں مسلسل ناتندرستی کے سبب سے بہت حد درجہ ہوا جاتا ہوں، غموں نے دل کو بالکل خستہ و مجروح کر دیا ہے، زندگی بار ہے، یہ مطلع تسکین دل کے لیے کہہ لیا ہے

اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا ۔ مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

دعاگوئے شما

اکبر

۲۸ مئی ۱۷ء

مکرمی خدا خوش رکھے۔

انتخاب میں سخت الجھن ہوتی ہے۔ میں نے ایک نیاز نامے میں عرض کیا تھا کہ آپ سے ملنے کا

بہت مشتاق ہوں، لیکن خدا جانے یہ آرزو کب پوری ہو، میری یہ حالت ہے، زندہ ہوں لیکن نشاط زندگی باقی نہیں، چند شعر مسودے سے نقل کرکے بھیجتا ہوں، بعد رنج حذف و ترمیم کے بعد شائع فرمایئے، یا ناپسند کر دیجئے، پھر کچھ اشعار بھیجوں گا، بہت زیادہ نہیں، بہ قول مولانا شبلی مرحوم کے، جو کہنا تھا کہہ چکا،

آپ کے مصائب میں اظہار ہمدردی کرچکا ہوں، ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہوگی، غالباً خانۂ آبادی کا مشورہ دیا جائے

حسن نظامی صاحب کو آپ نے ٹوکا تھا، کچھ معلوم نہیں حضرت اقبال کدھر جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ اپنا دل اپنا کام،

آپ کا دعاگو

اکبر

الہ آباد - ۳ر جون ۱۷ء

یار اگر نشست با مانیست جائے اعتراض

بادشاہ کامراں بود از گدایاں عار داشت

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ - آپ نے میرے اشعار کی رسید تحریر نہ فرمائی، اب میرے حواس درست نہیں رہتے، خدا جانے کیا قلم سے نکل جاتا ہے، کیا گلہ کروں، بھول جاتا ہوں کہ مخاطب کون ہے، ایک بات لکھتا ہوں، اس کی تشریح رہ جاتی ہے، سوء ظن کو جگہ مل سکتی ہے، خیر جو کچھ ہو، اپنی خیریت تحریر فرمایئے، آپ یقیناً خود بہت اندوہناک ہوں گے، مجھ سے آپ تو دیکھئے کہ غم نے کیا حال کر دیا ہے، کیسی خانہ ویرانی ہوگئی ہے، آپ تو ابھی کم عمر ہیں، دنیا میں بہت کچھ کرنا باقی ہے، اور کام کرنے کی قابلیت بھی ہے، بے مثل قابلیت۔

اگر فرصت ملے تو کچھ اور اشعار کہیے، یاد غم نام رکھیے، آپ کے دوست ینگ فلاسوفر برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں، اس کا خیال ہمارے تصوف کا پورا مؤید ہے،

جواب آنے پر کچھ اور اشعار عرض کرنے کی جرأت ہوگی، امید ہے کہ ظریفانہ اشعار کے سوا کچھ اور اشعار بھی آپ کی پسند کے لائق نکل آئیں۔

اکبر

الہ آباد - ۱۳ر جون ۱۷ء

حبیبی و مکرمی سلّمہ اللہ تعالیٰ

خدا جانے آپ اعظم گڈھ میں تشریف فرما ہیں یا نہیں، کئی نیازنامے جواب سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ آپ کو بہ ایں جلالت علم و فضل و کمالات صوری و معنوی، سوء ظن سے محفوظ رکھے، ہم لوگ تو آپ کے دعاگو اور آپ پر ناز کرنے والے ہیں،

آپ کو جو پریشانیاں لاحق ہوئیں اور جو صدمہ پہنچا، افسوس کہ میں کچھ اظہار ہمدردی نہ کر سکا، لیکن غم نے میری حالت جو کر رکھی ہے اور جن آلام میں مبتلا ہوں اگر آپ کو معلوم ہوں تو تعجب کیجئے کہ جس قدر حواس باقی ہیں یہ بھی کیوں باقی ہیں،

نیازمند

اکبر حسین

پرتاب گڈھ - ۱۳ر جولائی ۱۷ء

مکرمی سلّمہ اللہ تعالیٰ

میں کل یہاں آیا ہوں، ڈیڑھ گھنٹے کا سفر بھی بار ہوا، عشرت سلّمہٗ نے معارف میں آپ کا مضمون میرے اشعار کے متعلق دیکھنا چاہا، اگر کوئی کاپی موجود ہو تو ان کے نام وی پی ایبل بھیج دیجئے،

ممنون ہوں گا۔

سید عشرت حسین ڈپٹی کلکٹر پرتاب گڑھ

مشغولی مبارک ہو، میں تو اب بہ نسبت زندگی کے زیادہ تر موت کے ساتھ ہوں، دعائے

خیر کا امید وار ہوں

آپ کا خیر طلب

اکبر حسین

الٰہ آباد - ۱۹/اگست ۱۷ء

مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر آپ کانپور گئے تو ممکن ہے کہ الٰہ آباد تشریف لائیں لیکن عبد الماجد صاحب سے سنا کہ آپ لکھنؤ ہی سے واپس گئے، میں وسط جولائی سے برابر علیل ہوں علیل تو رہتا ہی ہوں لیکن اب شکایتیں زیادہ ہوگئی ہیں، ناتوانی میں موسم کا اثر بہت ہوتا ہے، پچھلے خطیب میں ایک آرٹیکل آئے نوخیزان کالج جو پیشوائے اسلام بنتے ہیں، ان کا گلا ہے، سچی بات ہے لیکن علاج ہی کیا ہے۔

حضرت اقبال اب اسی میں اپنی نمود سمجھتے ہیں کہ افلاطون، حافظ شیراز، ابن عربی کو گالیاں دیں، کل سلسلۂ تصوف کو برا کہیں۔[1] کہتے ہیں کہ شاعری مذاقِ عرب کے مطابق ہو، لیکن خود فارسی ہی میں کہتے ہیں، بہر حال زمانے کا رنگ ہی یہ ہے،

عبد الماجد صاحب تو خالص فلسفے میں پناہ لیتے ہیں، حضرت اقبال تو جانشین رسول بنتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی کیا پوزیشن ہے، مجھ سے داد طلب ہوا کرتے ہیں، اصل یہ ہے کہ یہ بگڑنے کے دن ہیں، بننے کے دن نہیں ہیں، میں کیا اور کوئی کیا کرے، میں تو اپنے آلام میں خود مبتلا ہوں،

---

[1] حضرت اکبر صوفی مشرب اور اقبال مروجہ تصوف کے مخالف تھے۔ اس لیے دونوں بزرگوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں، یہ خط اسی زمانہ کا ہے، لیکن بعد میں یہ غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں، "م"

زندگی بھی ختم ہو چکی ہے، امید فردا اور طول امل سے تعلق ہی نہیں رہا، لقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقنٰکم اول مرۃ پر نظر ہے، من عمل صالحاً فلنفسہٖ ومن اساء فعلیھا صاف ہے، پھر طاقت جنگ بھی تو نہیں ہے، نہ علم نہ زور، ہاں آپ کے لیے ضروری ہے کیونکہ دنیا کو برتنا ہے، اور اللہ نے علم دیا ہے، یہ باتیں محض پرائیویٹ طور پر آپ کو لکھ دیں، زندگی میں کبھی ملنا ہوا تو بار دل کچھ اتر سکے گا۔

دیکھئے تو یہ مطلع کچھ با معنی ہے یا نہیں،

مرنے والا مرگیا اور رونے والا رو چکا ‏ ‏ ‏ وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

آپ نے عبرت و بے ثباتی دنیا کے مضامین لکھے، بہت اچھا کیا، میرے دل کا رخ تو اب اسی طرف ہے، البتہ توحید کے مضامین بھی بہت زیادہ ذہن میں آتے ہیں، پھر لکھوں گا ان شاء اللہ

اکبر حسین

الٰہ آباد - کیم ستمبر ۱۷ء

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کے حالات و خیالات آپ کو ترقی مراتب انسانی کی طرف لیے جاتے ہیں، آپ آپ ہی ہیں، اور یوں تو کلرکوں کی لائن دنیا کے لیے کھلی ہوئی ہے، لکیلا تاسوا علیٰ مافاتکم ولا تفرحوا بما اتٰکم بہت صحیح ہے،

آپ نے میرے شعر کا جو انتخاب کیا، ہے بھی یہی بات "کے دن کے لیے اور کس کے لیے"

آپ سے ملنا ہوتا تو انتخاب اشعار میں مدد ملتی، مسودے بے ترتیب پڑے ہیں، مجھ کو تو ضعف و علالت نے بہت معذور کر رکھا ہے، جرأتِ سفر بہت کم ہے، ہو سکتا تو خود وہیں پہنچ کر قیام کرتا، کیوں نہ ہفتے عشرے کو آئیے، بل سفر خرچ میرے ذمہ، سب کورٹ انسپکٹر محمد احسن صاحب نے میرے خط کا جواب نہ دیا، شکایت کر دیجئے گا۔

نیاز مند

اکبر حسین

تلخیص و تبصرہ

افریقہ کی ایک نئی آزاد اسلامی حکومت

زنجبار

زنجبار دو جزیروں پر مشتمل ہے، ایک خود زنجبار جس کا رقبہ ۶۴۰ مربع میل اور آبادی تقریباً ایک لاکھ پچہتر ہزار ہے، دوسرے جزیرے کا نام بامبا ہے اور وہ زنجبار کے شمال میں واقع ہے جسکا رقبہ تین سو اسی مربع میل ہے اور اسکی آبادی ایک لاکھ چالیس ہزار ہے، یہ دونوں جزیرے جمہوریۂ تنجانیقا (ٹنگانیکا) کے متوازی اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہیں،

ایک ہزار دو سو سال (۱۲۰۰) پہلے مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی، یہاں بھی اسلام کی تبلیغ کی گئی، بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ عبد الملک بن مروان کے عہد حکومت (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) میں افریقہ کے ساحلی شہروں میں اسلام پھیلا جبکہ عمان سے عربوں کی ایک جماعت یہاں داخل ہوئی تھی،

مشرقی افریقہ کے ساحل کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زنجبار اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہاں کی تہذیب میں اسلامی اثرات زیادہ موجود ہیں اور فن تعمیر میں عربوں کا مذاق غالب ہے، ساحل افریقہ کی زبانوں میں تقریباً دو تہائی الفاظ کا اصل و مرجع عربی زبان ہے، باقی ایک تہائی الفاظ بھی اکثر عربی ہی ہیں، لیکن وہ کافی بدل چکے ہیں

قدیم زمانہ سے آج تک زنجبار کے فرمانروا مسلمان ہی ہوتے رہے ہیں، یہاں مسجدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، خاص پایۂ تخت میں مسجدوں کی تعداد ۰۰ ۱ سے زیادہ ہے، حالانکہ اس کا رقبہ ۲ ½ مربع میل سے زیادہ نہیں،

افریقہ کی دوسری حکومتوں کی طرح اس کو بھی استعماریت کا شکار ہونا پڑا، اور یہ پہلے پرتگالی، پھر برطانوی اور آخر میں جرمن نوآبادی یعنی زنجبار، برطانیہ کے سیر جون کیرک (سر جان کیرک) اور جرمنی کے جیرہارد رولفس (جرہارڈ رولفس) کے درمیان وجہ نزاع اور باعث کشمکش رہ چکا ہے، تا آنکہ نومبر ۱۸۹۰ء میں ایک رائے پر اتفاق ہوا جس کے بموجب برطانیہ نے جزیرہ ہیلیغولاند (ہیلگولینڈ) کو جو شمالی سمندر کے کنارے واقع ہے، جرمنی کے حوالے کرکے اس کو زنجبار کے مطالبہ سے دستبردار کرادیا، اور جب یہ برطانیہ کی مکمل نوآبادی بن گیا تو اس نے سابق سلطان خلیفہ بن حاروب کو برقرار رکھا اور اس کو بعض ذاتی خود مختاری بھی دی، لیکن زنجبار میں جب وطنی آزادی کی تحریک از سر نو اٹھی تو ۱۹۵۷ء میں برطانیہ کو بنیادی دستور اور حقوق دینے کے لیے مجبور ہو جانا پڑا، چنانچہ ۲۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو برطانوی استعمار نے پورے ملک میں عام انتخابات کرانے کی منظوری دیدی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہی لوگ انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں جن کی عمر ۲۵ سال ہو اور جن کی سالانہ آمدنی ۳۰۰ گنی استرلینا (اسٹرلنگ) ہو اور جو انگریزی یا عربی اور یا علاقائی ساحلی زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں اچھی استعداد رکھتے ہوں، اس انتخاب میں صرف ۶ ممبر منتخب ہوئے، اور ۱۰ ممبروں کو خود برطانیہ نے نامزد کیا،

۱۹۶۰ء میں حکومت کے دستور نے طے کیا کہ ایک مجلس انتظامیہ اور ایک قانون ساز جماعت کی تشکیل عمل میں آنی چاہیے، مجلس انتظامیہ کا صدر کوئی برطانوی شخص ہوگا، اور قانون ساز جماعت ۲۲ منتخب اور ۳ دائمی اور ۵ نامزد ممبروں پر مشتمل ہوگی،

دسمبر ۱۹۶۱ء میں پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے جس میں ۳ پارٹیوں نے حصہ لیا، آفرو، شیرازی

(ایفرو-شیرازی) پارٹی کو ۲۲ جگہوں میں، ۱۰ حزب وطنی (ریپبلکن پارٹی) کو ۹ اور حزب شعب (عوامی پارٹی) کو ۲ جگہیں ملیں، عوامی پارٹی کے لیڈر شیخ محمد شمطی ریپبلکن پارٹی کے اشتراک سے ایک مشترکہ حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئے، لندن میں طویل مذاکرات اور کافی گفت و شنید کے بعد اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کو زنجبار آزاد کردیا جائے۔

یہاں کے لوگوں کا گذر اوقات لونگ اور ناریل کی پیداوار پر ہوتا ہے جس سے ۹۵ فیصدی یہاں آمدنی ہوتی ہے، ۱۹۶۰ء میں زنجبار کی پیداوار کی کل قیمت ۵۷۲۶۸۵۹ گنی تھی جس میں ۳۵۳۵۲۲۱ گنی لونگ کی قیمت تھی، لیکن یہ پیداوار اس وقت کیلئے کافی نہیں ہوسکتی جب کہ حکومت کے اخراجات بڑھ جائیں گے، اس لیے حکومت آمدنی کے دوسرے ذرائع پر غور کررہی ہے، چنانچہ موجودہ حکومت کوکو کی پیداوار اور کاشت کیجانب متوجہ ہورہی ہے لیکن ابھی اس میں تاخیر بھی ہوگی اور مانگ بھی زیادہ نہ ہوگی اس لیے سردست ساری توجہ ماہی گیری اور زیادہ پھل پیدا کرنے کی طرف ہوگئی ہے، لیکن یہ ابھی تک نہایت محدود ہے، اور اس سے صرف مقامی باشندوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں، اسلیے اب اس کا دائرہ وسیع کردیا گیا ہے تاکہ وہ جزیرہ کی مستقل آمدنی ہوجائے، اس سلسلہ میں زنجبار کی حکومت نے ایک یونانی کمپنی کو اپنا شریک کار بنالیا ہے، امید ہے کہ اس طرح مچھلیوں کے شکار سے [illegible] کے شروع تک ۳۵۰ ہزار گنی کی مستقل سالانہ آمدنی ہوا کرے گی،

گو زنجبار دینی علوم کے لحاظ سے مشرقی افریقہ کے دوسرے شہروں سے آگے ہے لیکن برطانوی استعمار نے اس سلطنت کو دینی اعتبار سے نہایت کمزور کردیا ہے، اور تمام مدرسوں میں شرعی تعلیم کے مقابلہ میں نئے علوم پر زیادہ اخراجات ہورہے ہیں، اور انگریزی تعلیم کے مقابلہ میں عربی زبان غیر اہم ہوگئی ہے، اسلیے زنجبار کو مشرقی افریقہ کے دوسرے ساحلی شہروں کی طرح اسلامی حکومتوں کے مبلغین، تصنیفات اور مدرسین کی سخت ضرورت ہے، تاکہ عربی زبان اور اسلامی علوم کو پھر ان کا اصلی اور گذشتہ مقام حاصل ہوسکے اور وہاں کے مسلمانوں کا اپنے دین اور دینی زبان سے مضبوط رشتہ اور مستحکم تعلق قائم ہوجائے۔ (ماخوذ از الحج، نومبر ۱۹۶۳ء)

"ض"

ادبیات

نعت

از زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی

حجاب از چشم ما کردی چہ کردی — خراب ماسوا کردی چہ کردی

فراغ دل عطا کردی چہ کردی — بعشرت آشنا کردی چہ کردی

بگیسو ام کہ داری پیچ در پیچ — بلا اندر بلا کردی چہ کردی

ز زیبد بندگاں را بے نیازی — تو ترک التجا کردی چہ کردی

فروغ زندگی ما غمت بود — ز بند غم رہا کردی چہ کردی

دل و جانم فدائے ہر جفایت — چرا ترک جفا کردی چہ کردی

ہمہ بیگانہ گشتی و دلم را — سراپا التجا کردی چہ کردی

حمید از نغمہ ہائے جانگدازے

قیامت ہا بپا کردی چہ کردی

نعت

از پروفیسر سید حسن ماہر، پٹنہ

جو ذکر آیا محمدؐ کا، درود آیا سلام آیا
لبوں نے لے لیا بوسہ، زباں پر کس کا نام آیا

وہ آیا بزمِ امکاں میں تو عالم میں نظام آیا
زمیں میں آگئی گردش، فلک کو بھی خرام آیا

بشارت دی فرشتوں نے زمیں کے رہنے والوں کو
وہ عالم جس سے روشن ہے، وہی ماہِ تمام آیا

زباں شیریں، بیاں صادق نگہ نیچی، قدم ثابت
وہ فخرِ انبیاء وہ درخورِ صد احترام آیا

تھی دوری طالب و مطلوب میں بس دو کمانوں کی
شبِ اسریٰ محبت کا اک ایسا بھی مقام آیا

محمدؐ کی ثنا گوئی بنی عنوانِ بخشائش
قیامت میں مرا شغلِ سخن بھی میرے کام آیا

مدینہ کو اگر جائیں تو ماہر اس طرح جائیں
کہ چرچا ہو دیارِ پاک میں اسکا غلام آیا

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

جب میری دعا نیم شبی مانوسِ اثر ہو جاتی ہے
آثارِ سحر سے پہلے ہی امید سحر ہو جاتی ہے

تم دور رہو یا پاس رہو ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے
اک روز کا کٹنا کیا معنی اک عمر بسر ہو جاتی ہے

اللہ رے سرورِ کیف آگیں، اٹھتے ہی نقابِ روئے حسیں
تکمیلِ طلب ہو جاتی ہے تسکینِ نظر ہو جاتی ہے

آتا ہے شبستانِ گل میں اک ذوقِ طرب ایسا بھی کہ جب
ہلکی سی صدائے غنچہ بھی پیغامِ سحر ہو جاتی ہے

جب ذوقِ جنوں کی منزل میں سب دوست جدا ہو جاتے ہیں
خود اٹھ کے مری ہی گردِ سفر دمسازِ سفر ہو جاتی ہے

رندی بھی اسی کی ہے رندی، مستی بھی اسی کی ہے مستی
میخواروں میں جس کی لغزش پر ساقی کی نظر ہو جاتی ہے

دنیائے محبت میں جوہر دیکھا ہے یہی ہم نے اکثر
جب کوئی تصادم ہوتا ہے عالم کو خبر ہو جاتی ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

تاریخ شیراز ہند جونپور از سید اقبال احمد صاحب، ضخامت ۲۸۰ صفحات، کتابت و طباعت متوسط، پتہ ادارۂ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس رضوی خاں جونپور، قیمت بارہ ۱۲ روپے۔

دینی، سیاسی، تمدنی اور علمی خصوصیات کی وجہ سے اسلامی عہد میں ہندوستان کے جو شہر منتخب روزگار تھے اُن میں ایک جونپور بھی تھا، جسے شیراز ہند کا خطاب ملا تھا، یہ گو بہت قدیم شہر ہے، مگر اس کی ترقی کا زریں دور سلطنت شرقیہ کا زمانہ ہے، اس دور میں تمدنی و سیاسی مرکزیت کے ساتھ اسے پورے ہندوستان کی علمی سیادت بھی حاصل تھی، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے ہزاروں اہل علم اور اربابِ فن اور شعراء و ادباء یہاں جمع ہوگئے تھے، اور یہ خطہ واقعۃً "شیراز ہند" بن گیا تھا،

یوں تو جونپور کی متعدد تاریخیں اور وہاں کے علماء و صلحاء اور شعراء و ادباء کے تذکرے لکھے گئے ہیں، مگر اب تک اس کی کوئی مفصل تاریخ مرتب نہیں کی گئی تھی، سید اقبال احمد صاحب جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے بڑی تحقیق و تلاش سے یہ ضخیم کتاب مرتب کی ہے، اس کتاب میں انھوں نے سفینوں کے ساتھ سینوں کے ذخائر سے بھی مدد لی ہے، اس لیے یہ کتاب اپنے موضوع پر ماخذ بن گئی ہے، امید ہے کہ یہ اہلِ علم میں شوق سے پڑھی جائے گی،

کائنات میں انسان کا مقام ۔ از مولانا محمد تقی امینی صاحب، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر ادارہ علم وعرفان، اللہ رکھا بلڈنگ، اجمیر شریف۔

انسان جس طرح اپنی تخلیق میں اپنے خالق کا محتاج ہے، اسی طرح کائنات میں اپنے مقام کی تعیین میں بھی اسے اپنے خالق کی ہدایات کی طرف رجوع کرنا چاہیے، انسان کو جو عقل و بصیرت دی گئی ہے، اس کو جب خالق کائنات کی ہدایات کے خلاف استعمال کیا ہے تو اس نے دنیا میں اپنے قیام کی تعیین میں غلطی کی ہے، مولانا تقی امینی صاحب نے اس کتابچہ میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان کے مقام کی تعیین کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا کو تھیالوجیکل ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اس موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی، اسی مقالہ کو اب کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، امید ہے کہ یہ مقالہ شوق سے پڑھا جائیگا،

ترجمہ مختارات دو حصے ۔ مترجمہ جناب مولانا ظل الرحمن ندوی الاثری، ضخامت جلد اول ۷۵ ص، جلد دوم ۷۶ ص، ناشر حاجی محمد عبد القیوم، ۱۶ ویلسلی اسکوائر، کلکتہ ۱۳، مجموعی قیمت پانچ روپے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عربی مدرسوں کے نصاب ادب کے لیے مختارات کے نام سے ایک انتخاب شائع کرایا تھا جو متعدد دینی مدارس کے کورس میں داخل ہے، اس قسم کی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنا مناسب نہیں، تاہم ایسے طلبہ کے لیے جو صرف امتحانات پاس ہونا چاہتے ہیں، یہ ترجمے مفید ہونگے، جو دو حصوں میں ہے۔

تذکرۂ اسلاف ۔ از مولانا محمد بہاء الحق قاسمی صاحب، ضخامت ۱۴۴ صفحے، تقطیع اوسط، ملنے کا پتہ پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی، ۱۔اے بلاک ماڈل ٹاؤن، لاہور

ہندوستان کے جو خاندان علم و فضل کے علاوہ رشد و ہدایت اور سلوک و طریقت کے بھی گہوارہ رہ چکے ہیں، ان میں امرتسر کا ایک خانوادۂ قاسمیہ بھی ہے، جس کی بدولت کشمیر، سیالکوٹ اور امرتسر وغیرہ میں ایک عرصہ تک علم و عرفان کی شمع روشن تھی، مولانا بہاء الحق خطیب

جامع مسجد ماڈل ٹاؤن لاہور بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور اس کتاب میں انھوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات و سوانح اور ان سے مستفیض ہونے والے دوسرے علماء اور اصحاب کمال کا بھی ذکر کیا ہے، سب سے پہلے انھوں نے اپنے خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا قاضی محمد جمال الدین کے حالات لکھے ہیں، جو آگرہ سے ہجرت کر کے کشمیر آئے اور نویں صدی میں سلطان کشمیر زین العابدین بڈشاہ کے عہد میں وہاں کے قاضی القضاۃ مقرر ہو گئے تھے، یہ کتاب گو مختصر ہے لیکن اس سے کشمیر اور پنجاب کی علمی، مذہبی اور روحانی سرگرمیوں سے متعلق کچھ مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، کتابت و طباعت کا معیار بہتر ہوتا تو استفادہ کرنے والوں کو اور زیادہ سہولت ہوتی۔

اشعار اکبر ۔ مرتبہ پروفیسر سید حسن، پٹنہ یونیورسٹی، ضخامت ۱۹۰ صفحے، تقطیع اوسط، کتابت و طباعت بہتر، ناشر کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ، قیمت : تین روپے

اس میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر سید حسن صاحب نے اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کے کلام کا مختصر انتخاب کیا ہے، شروع میں ایک طویل دیباچہ ہے، جس میں اکبر کی زندگی کے حالات و سیرت کے علاوہ ان کے کلام کی مختلف خصوصیات پر ناقدانہ مطالعہ بھی ہے، لائق مرتب ایک مشہور اہل قلم ہیں، ان کی تحریروں میں شگفتگی، متانت اور خوش مذاقی ہوتی ہے، زیر نظر کتاب کے دیباچہ میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یہ طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے لیکن اس میں اکبر کے کلام پر جو متوازن تنقید ہے، اس لحاظ سے امید ہے کہ اہل ذوق بھی اس کا مطالعہ شوق سے کرینگے۔

ملاقاتیں ۔ مرتبہ جناب الطاف حسین صاحب قریشی، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، ضخامت ۲۷۲ صفحے مجلد خوبصورت گردپوش قیمت ۵ر، پتہ منیجر مکتبہ اردو ڈائجسٹ ۵۔ مین روڈ سمن آباد، لاہور۔

اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن صاحب قریشی ایم اے وقتاً فوقتاً اپنے رسالہ میں پاکستان

کی بعض اہم اور ممتاز شخصیتوں سے انٹرویو لیکر ان کے افکار و خیالات شائع کرتے رہتے ہیں، اب انھوں نے اس کے کچھ حصے پیش نظر کتاب میں شائع کیے ہیں، اس میں ۱۶ ناموَر شخصیتوں کی ملاقاتوں کا ذکر ہے، جن میں روشن خیال علما، اور ممتاز اہل قلم اور ادیب بھی ہیں اور سیاستداں ماہرین قانون، معلم فلسفی بھی ہیں، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا غلام رسول مہر، مسٹر اے کے بروہی، جسٹس ایم آر کیانی، جسٹس محمد شریف، جسٹس ایس۔ اے رحمٰن، مولوی تمیز الدین خاں مرحوم، میاں بشیر احمد، اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ۔

ان ملاقاتوں میں مختلف مسائل پر جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ مفید اور دلچسپ ہیں، شروع میں مرتب نے اکابر شخصیتوں کے متعلق اپنے تاثرات کا بھی اظہار کیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔

فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور } مرتبہ جناب منظور احمد عباسی صاحب، ضخامت ۲۸۴ صفحے، ملنے کا پتہ: پنجاب پبلک لائبریری لاہور، قیمت ندارد

پنجاب پبلک لائبریری لاہور کے عربی مخطوطات کی اس فہرست میں ۴۲۲ کتابوں کا ذکر ہے، اسی کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی ہے، جس میں ۵۲ قلمی کتابوں کا ذکر ہے، اس طرح یہ فہرست کل ۴۷۴ مخطوطات پر مشتمل ہے، کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرستوں کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے، اور اس سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے، اس لیے اس فہرست کی اشاعت پر عباسی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں،

"م، ج"

جلد ۹۴۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۴ء۔ عدد ۳

فہرست مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ